فہرست مضامین

جون ۲۰۰۴ء

اداریہ

پوری دنیا میں ایک پریشانی و بے اطمینانی کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ عالم اسلام یہود و نصاریٰ کے ظلم کا نشانہ ہے۔ کربلا میں پھر کربلا ہے۔ مساجد مبارکہ اور مزارات مقدسہ پر گولیاں برسائی جارہی ہیں۔ عراق کے بے گناہ قیدیوں کے ساتھ امریکی فوجوں کے غیر انسانی سلوک اور فلسطینی عوام پر اسرائیلی مظالم کو دیکھ کر تمام عالم اسلام بلکہ ہر ہمدرد انسان ذہنی اذیت میں مبتلا ہے۔ ایسے عالم میں آج سے ۱۵؍برس پہلے ۳؍جون کو دنیا سے رخصت ہونے والے رہبر انقلاب آیت اللہ خمینیؒ کا کردار شدت سے یاد آتا ہے۔ جنہوں نے بار بار امریکہ و اسرائیل کی ناپاک سازشوں سے عالم اسلام کو خبردار کیا اور کہتے رہے کہ اگر پوری دنیا کے مسلمان متحد ہو کر صرف ایک ایک بالٹی پانی ڈال دیں تو اسرائیل کے وجود کا پتہ نہ چلے۔ ایک دوسرے مقام پر امام خمینیؒ نے فرمایا:

''ہمیں میدان عمل میں آنا چاہئے صرف زبانی جمع خرچ سے کوئی فائدہ نہیں۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ ایرانی علماء کی طرح وہ بھی میدان میں اتریں اور بڑی طاقتوں کی دست درازیوں سے عوام کو نجات دلائیں اور اسلام کے مقابلے میں انہیں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیں۔ ایسا نہ کریں تو ان کے خلاف مثبت اقدامات کریں۔ کسی چیز سے ڈرنے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مسلمانوں کی تمام پریشانیاں بڑی طاقتوں کی ایجاد کردہ ہیں جو ان کے نمک خوار غلاموں کے ذریعہ مسلمانوں پر مسلط کی گئی ہیں جب تک ان سے نجات حاصل نہیں ہوتی یہ پریشانیاں یوں ہی برقرار رہیں گی۔ امریکہ کو کیا حق حاصل ہے کہ اپنی حدوں سے عبور کر کے اسلامی دنیا کے معاملات میں دخل اندازی کرے اور اسلامی ممالک کی تقدیریں معین کرے۔ کیا یہ مسلمانوں کے لئے ننگ و عار کا مقام نہیں ہے کہ ایک ارب مسلمانوں پر مشتمل ممالک اسلامیہ کی تقدیروں کا فیصلہ ایک دشمن خدا، دشمن اسلام بلکہ دشمن انسانیت کے ہاتھوں میں دے دیا جائے۔''

امریکہ برسوں سے اپنے کو انسان دوست اور انسانیت پسند ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کئے ہوئے ہے اور آج بھی اپنی بربریت کے باوجود اپنے کو انسانیت کا علمبردار منوانا چاہتا ہے لیکن اب دنیا امریکہ کو انسانیت کا دشمن مان کر کسی نہ کسی انداز میں آیۃ اللہ خمینیؒ کی بصیرت کو داد دے رہی ہے لیکن اب بھی افسوس کی بات یہ ہے کہ دوسروں کو دہشت گردی کی سند دینے والے امریکہ کی کھلم کھلا دہشت گردی اور انسانیت سوزی کے خلاف آواز اٹھانے کے لئے اسلامی حکومتوں میں ہمت جمع نہیں ہو رہی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہندوستان سے معین الشریعہ حجۃ الاسلام مولانا سید کلب جواد نقوی صاحب نے

عراق میں ہونے والے امریکی مظالم کے خلاف احتجاج کے لئے لکھنؤ میں مظاہرے کا اعلان کیا جس میں ۳۰ رمئی کو بلاتفریق مذہب و ملت کئی لاکھ عوام و خواص نے شرکت کر کے احتجاج کو کامیاب بنایا۔ اس کامیاب احتجاج کے بعد ۲۰ رجون کو دہلی میں ایک تاریخی ریلی کا پروگرام بنایا گیا ہے۔ معین الشریعہ اس ریلی کو کامیاب بنانے کے لئے پوری طرح منہمک ہیں۔

ربیع الثانی جہاں حکم اقامت صلوٰۃ کا مہینہ ہے وہیں ''قَدْاَقَمْتَ الصَّلٰوۃَ'' کے مصداق صابر مجاہد، فرزند رسولؐ و بتولؑ، امام یازدہم حضرت حسن عسکری علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت باسعادت کا بھی مہینہ ہے تاریخ شاہد ہے کہ اسی ماہ مبارک میں سلیمان خزاعی اور جناب مختار نے قیام کیا۔ چنانچہ مومن کی معراج یعنی نماز کی اقامت کے ساتھ اس سے استعانت کرتے ہوئے صبر و شکر سے زندگی بسر کرنا اور دنیا کے ہر ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا جناب مختار اور ان کے ہمنواؤں کے مشن اور مقصد امام علیہ السلام کو خراج حیات پیش کرنا ہے۔

گزشتہ شمارے کے دائرۂ منثورات میں آیت اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی، آیت اللہ استاد شہید مرتضیٰ مطہری نوراللہ مرقدھما، آیت اللہ العظمیٰ رہبر انقلاب اسلامی ولی امر مسلمین سید علی خامنہ ای مدظلہ الشریف، آیت اللہ شیخ جوادی آملی اور عماد العلماء علامہ ڈکٹر سید علی محمد نقوی مدظلہ کے کلک گہر سلک کے علمی و تحقیقی آثار نمایاں ہیں۔ صفحۂ منظومات، سید المتکلمین ابوالبراعہ علامہ سید ظفر مہدی نقوی گہرؔ جائسی، (مترجم و شارح نہج البلاغہ و مدیر ماہنامہ ''سہل یمین'') علامہ سید کلب احمد نقوی ماتؔی جائسی، سید الشعراء سید محمد حسن نقوی سالکؔ مرحوم، عارف کامل مولانا شاہ نعیم عطا (سجادہ نشین آستانہ عالیہ سلون) نعیمؔ سلونی، امتیاز الشعراء مولوی سید محمد جعفر قدسیؔ جائسی مرحوم (مصنف کتب متعددہ و مترجم بحار الانوار و معارف الملّۃ وغیرہ) اور رضاؔ جائسی کے مدحتی و منقبتی نقوش ثبت ہیں۔

قوی امید ہے کہ استفادہ کنندگانِ ماہنامہ شعاع عمل، مؤسسہ نور ہدایت دیگر علم دوست جیالوں کو رسالہ کی قرأت واعانت کی طرف ضرور متوجہ کریں گے۔

اگر علماء یعنی ورثۃ الانبیاء اور امراء یعنی وکلاء پروردگار کی چشم عنایت و نظر کرم جریدہ کے امور و مشکلات پر مرکوز رہی تو یقیناً شماروں کا معیار بھی انشاء اللہ العزیز برقرار رہے گا اور ارکان ادارہ بھی راہ ارتقا پر ثابت قدم رہ سکیں گے۔

مؤسسہ نور ہدایت

حسینیۂ حضرت غفران مآبؒ چوک لکھنؤ

(اتر پردیش) ہندوستان

قرآن شناسی

قرآن مجید کا دوسرے علوم سے تعلق

فیلسوف اسلام، مفسر عظیم علامہ سید محمد حسین طباطبائی علیہ الرحمہ
ترجمہ: ڈاکٹر شاہد چوہدری صاحب

الف: قرآن مجید کی طرف سے علم کی نسبت احترام اوراس کو حاصل کرنے کی ترغیب۔

ب: وہ علوم جن کو حاصل کرنے کے لئے قرآن مجید دعوت دیتا ہے۔

ج: قرآن مجید سے متعلق خاص علوم۔

الف: قرآن مجید کی طرف سے علم کی نسبت احترام اوراس کو حاصل کرنے کی ترغیب

وہ عزت اور احترام جو قرآن مجید نے علم و دانش کی نسبت اظہار کیا ہے اس کی مثال کسی بھی دوسری آسمانی کتاب میں نہیں ملتی اور اس بارے میں یہی کافی ہے کہ قرآن مجید نے اسلام سے پہلے عربوں کی وحشت گری کے زمانے کو جاہلیت کہہ کر پکارا ہے۔

قرآن مجید سینکڑوں آیات میں مختلف طریقوں سے علم و دانش کا نام لیتا ہے اور ان میں سے بہت زیادہ آیات میں علم و دانش کی عظمت کو نمایاں کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ انسانوں پر احسان کرنے کے بارے میں فرماتا ہے عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (سورۂ العلق ۵) ترجمہ: انسان جو کچھ نہیں جانتا، ہم نے اسے سکھایا ہے اور پھر فرماتا ہے : یَرْفَعُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوْا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ط (سورۂ مجادلہ آیت ۱۱) ترجمہ: خدا تعالیٰ ان انسانوں کی عظمت کو بہت بلند کرتا ہے جو ایمان لائے ہیں اور جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے ان کے مرتبوں کو چند گنا زیادہ کرتا ہے اور آخر کار فرماتا ہے :هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ط (سورۂ زمر آیت ۹) ترجمہ: آیا جو لوگ صاحب علم ہیں اور جو لوگ علم نہیں جانتے وہ دونوں برابر ہیں؟

اس بارے میں قرآنی آیات بہت زیادہ ہیں اور احادیث نبویؐ اور احادیث ائمہ اہلبیتؑ جو قرآن مجید کے بعد دوسرے درجہ پر ہیں، ان میں بھی بہت زیادہ ذکر آیا ہے۔

ب۔ وہ علوم جن کو حاصل کرنے کے لئے قرآن مجید دعوت دیتا ہے

قرآن مجید بہت زیادہ آیات میں (جن کی کثرت اور زیادتی کے باعث سب کو یہاں نہیں لکھ سکتے) جو انسان کو آسمان، درخشاں ستاروں اور ان کے درمیان عجیب وغریب پیدا ہونے والے اختلافات اور حالات اور ایسے ہی ان پر حاکم مضبوط نظام پر غور کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

زمین، سمندروں، پہاڑوں، بیابانوں اور تمام عجائبات کے متعلق جو زمین کے اندر موجود ہیں اور شب و روز کے اختلافات، موسموں کے تغیر و تبدل پر غور و فکر کرنے کی

ترغیب دیتی ہے۔

اسی طرح عجیب وغریب نباتات اوران میں موجود نظام زندگی کی فطرت اورحیوانات کے حالات وآثاراور ماحول کے بارے میں غور وفکر کرنے پر تشویق کرتی ہیں جو ان سے پیدا ہوتے ہیں۔

پھرانسانی پیدائش اوراس کے وجود میں چھپے ہوئے اسرارورموزاوران سے بڑھ کران باطنی دنیاؤں (قوتوں) میں جن کے ذریعے یہ انسان عالم بالا اور فرشتوں کے ساتھ رابطہ قائم کرتا ہے اور اسی طرح زمین کے اندر سیر کرنے اور گزشتہ قوموں،لوگوں کے آثار کا مشاہدہ،قوموں کے حالات و واقعات اور انسانی معاشروں ،قصوں ،داستانوں اور تاریخی کتابوں میں تحقیق وتفتیش کرنے پراصرار کرتی ہیں۔

اسی طرح علوم طبیعی ،ریاضی ،فلسفہ،فنون ادبی اور آخرکاران تمام علوم کی تعلیم وتربیت کی طرف بھی دعوت دیتی ہیں جو انسانی فکر کی دسترس میں واقع ہوں اوران کو سیکھنا اور سکھانا، دنیائے انسانی اورانسانی معاشرے کی سعادت اورترقی شمار ہوتے ہیں۔

ہاں! قرآن مجید ان تمام علوم کی طرف دعوت دیتا ہے بشرطیکہ وہ علوم انسان کو حق وحقیقت کی طرف ہدایت کر سکیں اور انسان ان سے رہنمائی حاصل کر سکے اور حقیقی جہان بینی کو جس کا نتیجہ خدا کی حقیقت کو سمجھنا ہے پالیں ورنہ وہ علم جو انسان کو اپنے آپ میں مشغول رکھے اور حق وحقیقت کی شناخت سے منع کرے،قرآنی لغات میں جہل و نادانی کے مترادف ہے ۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ۔

(سورۂ روم آیت ۷) ترجمہ: وہ لوگ اس دنیا کی ظاہری زندگی کو ہی جانتے اور سمجھتے ہیں اور وہ اگلے جہان کی زندگی سے غافل ہیں۔اور پھر فرماتا ہے :اَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهُ هَوٰهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهِ وَ قَلْبِهِ وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهِ غِشٰوَةً فَمَنْ يَهْدِيْهِ مِنْ بَعْدِ اللّٰهِ (سورۂ جاثیہ آیت ۲۳) آیا تم نے دیکھا ہے ایسے شخص کو جس نے اپنی نفسانی خواہشات کو اپنا خدامان لیا ہواور خدانے اس کے علم کے باوجود اس کو گمراہ کر دیا ہواوراس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی ہواور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہو، پس کون ہے جو خدا کے بغیر اس کی رہنمائی اور ہدایت کرے گا؟

قرآن کریم نے باوجوداس کے کہ مختلف علوم حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے،خود بھی معارف الٰہی ،کلیات اخلاق اورفقہ اسلامی کی تعلیم دینے کی ذمہ داری قبول کی ہے۔

ج۔قرآن مجید سے متعلق خاص علوم

مسلمانوں کے درمیان بعض علوم ایسے بھی ہیں جن کا موضوع بحث خود قرآن مجید ہے۔ان علوم کی تاریخ پیدائش قرآن مجید کے نزول کے دن سے شروع ہوئی ہے اور آہستہ آہستہ ان کے مسائل لوگوں کے درمیان بڑھتے گئے اورعیب و نقص سے پاک ہوکرمکمل ہوتے گئے اورآخرکاران علوم وفنون کے محققین نے ان کے بارے میں بیشمار کتابیں لکھی ہیں۔ان علوم میں سے بعض قرآن مجید کے الفاظ کے متعلق ہیں اور بعض دوسرے اس کے معانی اور تحقیق کے بارے میں ہیں۔

وہ علوم جو قرآن مجید کے الفاظ وعبارات کے متعلق

بحث کرتے ہیں ان کو ''فنون تجوید'' (قرآن کو صحیح طریقے سے پڑھنا) اور ''علم قرأت'' کہتے ہیں۔ یہ فن حروف تہجی کے تلفظ اور مختلف صورتوں اور کیفیتوں کے بارے میں ہے یعنی عربی زبان کے مفرد اور مرکب الفاظ کا پیدا ہونا مثلاً حروف اور احکام وقف اور ابتداء وغیرہ کا آپس میں ملنے کے متعلق بحث کرتا ہے۔

ایک علم یا فن سات قسم کی مشہور قرأتوں اور دوسری تین قسم کی قرأتوں، صحابۂ کرام کی قرأتوں اور شواذ کی قرأتوں کے بارے میں بحث کرتا ہے۔

ایک علم قرآن مجید کی سورتوں کی تعداد، کلمات، حروف اور آیات کے بارے میں ہے۔

ایک علم یا فن خصوصاً قرآن مجید کے خاص رسم الخط اور عربی رسم الخط کے درمیان اختلاف کے متعلق بحث کرتا ہے۔

اور ایسے ہی دوسرے علوم جو قرآن مجید کے معانی کے متعلق بحث کرتے ہیں۔ ایک علم یا فن قرآن مجید کی آیات کے مجموعی معانی مثلاً نزول، تاویل، ظاہر، باطن، محکم متشابہ، (آیات) ناسخ اور منسوخ کے بارے میں تحقیق کرتا ہے۔ اور ایک فن قرآن مجید کی آیات اور احکام کے بارے میں بحث کرتا ہے اور دراصل فقہ اسلامی کا ایک حصہ ہے۔

ایک اور علم یہ ہے کہ قرآنی آیات کے خاص معانی کیا ہیں اور اس کو ''تفسیر قرآن'' کہتے ہیں۔

اسلامی محققین اور علماء نے ہر ایک مندرجہ بالا علوم جو خاص کر قرآن مجید کے بارے میں ہیں، بے شمار کتابیں لکھی ہیں۔

د۔ وہ علوم جن کی پیدائش میں خود قرآن مجید ایک اہم عنصر رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ وہ دینی علوم جو آج مسلمانوں کے درمیان رائج اور قابل تعلیم و تعلّم ہیں، ان کی تاریخ اور رائج ہونا پیغمبر اکرمؐ کی بعثت اور قرآن مجید کے نزول سے شروع ہوتی ہے اور ان میں معارف الٰہی اور قوانین شرعیہ شامل ہیں۔

یہ علوم پہلی صدی ہجری میں خلیفۂ اسلام کی طرف سے ممانعت کے باعث جو انہوں نے ان کی کتابت اور احادیث کی تالیف و تدوین وغیرہ پر نافذ کی تھی، صحابۂ کرام اور تابعین کے درمیان غیر منظم طور پر رائج اور جاری رہے اور سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے فقہ، تفسیر اور حدیث کے متعلق مختصر طور پر کتابیں لکھی ہیں، اکثر لوگ ان کو سینہ بسینہ یاد اور نقل کرتے رہے۔

دوسری صدی ہجری کے آغاز میں اس ممانعت کے اٹھ جانے سے بعض لوگوں نے احادیث کو لکھنے، اور پھر دوسرے علوم کے بارے میں مباحث تالیف کرنے کی طرف توجہ دی اور ان کو منظم اور مرتب کیا۔ (یہ ممانعت جیسا کہ تاریخ میں موجود ہے حضرت عمر بن عبدالعزیز اموی خلیفہ ۹۹۔۱۰۱ھ نے اٹھائی تھی)

اس طرح فن حدیث اور علم رجال اور ایسے ہی فن اصول فقہ، علم فقہ، علم کلام وغیرہ وجود میں آئے۔

اور حتیٰ کہ فلسفہ بھی اگرچہ پہلے پہل یونانی زبان سے عربی زبان میں داخل ہوا اور کچھ مدت کے لئے یونانی صورت

میں ہی قابل استفادہ رہا لیکن آہستہ آہستہ اسلامی ماحول اور طرز فکر میں ڈھل گیا۔ مادہ کے لحاظ سے بھی اور شکل وصورت کے لحاظ سے بھی اس میں تبدیلی پیدا ہوگئی۔ وہ فلسفہ جو آج کل مسلمانوں کے درمیان رائج اور جاری ہے اس میں معارف الٰہی کے بارے میں کوئی مسئلہ نظر نہیں آتا مگر یہ کہ اس کے متن اور دلائل و براہین کو جو اس کے ثابت کرنے کے لئے استعمال کئے گئے ہیں، ان کو قرآن و احادیث میں پیدا کر کے ان میں سے وہ فلسفہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اس بات کو عربی زبان کے ادبی علوم میں بھی پیش کیا جا سکتا ہے کیونکہ علم صرف ونحو، معانی، بیان، بدیع، لغت فن فقہ لغت (فلالوجی) اور اشتقاق وغیرہ۔ اگرچہ ان سب کا موضوع بحث مطلق عربی کلام ہی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ جس چیز نے لوگوں کو ان علوم کے اصول و قوانین لکھنے، تصفیہ اور تتبع کرنے پر ترغیب دی، وہی خدائی شاہکار ہے جس نے لوگوں کو اپنے شیریں بیان، خوبصورت اسلوب اور روش کا شیفتہ بنا لیا تھا اور لوگوں کو کلمات و تراکیب اور معانی و الفاظ، فصاحت و بلاغت اور لفظی صنائع کے واضح کرنے کی خاطر اس امر کی ضرورت پیش آئی تھی کہ ان کے کلی قوانین کو ان مثالوں سے جو عربی زبان میں موجود تھیں حاصل کریں اور اسی طرح صرف و نحو، لغت اور دوسرے تین فنون یعنی بلاغت، تنقیح اور تنظیم پیدا ہوئے۔

روایت ہے کہ ابن عباس جو مفسر صحابہ کرام میں سے تھے، آیات کے معانی کو عربی اشعار سے مثالوں کے ذریعے بیان کرتے تھے اور اسی طرح عربی اشعار کو جمع کرنے کی تلقین اور تاکید کرتے تھے اور فرماتے تھے: ''اَلشِّعْرُ دِیْوَانُ الْعَرَبِ'' عربی نظم ونثر کی طرف توجہات کے ساتھ لکھا گیا، یہاں تک کہ ایک شیعہ دانشور خلیل بن احمد بصری نے علم لغت میں ''کتاب العین'' لکھی اور علم عروض کو اشعار کے وزن پہچاننے کے لئے اختراع کیا اور اسی طرح دوسرے حضرات نے بھی ان دونوں علوم میں کتابیں لکھیں اور فن تاریخ بھی فن حدیث سے نکلا ہے۔ شروع شروع میں یہ فن قصص انبیاءؑ اور قوموں کی داستانوں اور سیرت پیغمبر اکرمؐ سے آغاز ہوا اور اس کے بعد اوائل اسلام کی تاریخ اس پر اضافہ ہوگئی، پھر دنیا کی تاریخ کی شکل بن گئی اور بعض مشہور مؤرخین مثلاً طبرسی، مسعودی، یعقوبی اور واقدی وغیرہ نے کتابیں لکھیں لہٰذا جرأت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ علوم عقلی یعنی طبیعیات اور ریاضیات وغیرہ کی طرف مسلمانوں کی توجہ کا اصلی عنصر شروع میں نقل اور ترجمے کی صورت میں تھا اور اس کے ساتھ ایک قسم کا استقلال اور جدت پسندی بھی تھی کہ آخر کار یہی علمی تحریک تھی جو قرآن مجید نے مسلمانوں کے لئے فراہم کر دی تھی۔

شروع شروع میں خلافت کے زمانے میں جو ان دنوں عربی قوم کے ہاتھ میں تھی، مختلف عقلی علوم یونانی، سریانی اور ہندی وغیرہ سے عربی زبان میں ترجمہ ہوئے اور اس کے بعد تمام مسلمانوں تک پہنچے جو مختلف قوموں اور ملتوں میں سے تھے اور دن بدن ان علوم میں تحقیقات، مطالب پر غور اور حسن انتظام بڑھتا چلا گیا۔

ظاہر ہے کہ وسیع اسلامی تمدن جو آنحضرتؐ کی ہجرت اور رحلت کے تھوڑے عرصے بعد دنیا کے بیشتر علاقوں کو اپنے زیر تسلط لانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور ان تمام متفرقہ ممالک میں حکومت شروع کر دی اور آخر کار آج تقریباً چھ سو ملین (۶۰ کروڑ) آبادی کو اسلام کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ (آج کل دنیا میں مسلمانوں کی کل آبادی ایک ارب سے زیادہ ہو چکی ہے۔مترجم) یہ بھی قرآن مجید کے دوسرے آثار میں سے ایک ہے۔ اگر چہ ہم شیعہ لوگ مذہب کے نام پر پہلے خلفاء، بادشاہوں اور اس تمدن کے دوسرے اہلکاروں پر ان کی غفلتوں کی وجہ سے جو انہوں نے اسلامی حقائق کو چھپانے اور اسلامی قوانین کا صحیح نفاذ نہ کرنے میں انجام دیں اعتراض کرتے ہیں لیکن بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کی کرنیں جو بھی اس دنیا پر پڑیں ان کا سرچشمہ قرآن مجید ہی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ تغیر وتبدل جو دنیاوی حوادث کے اہم سلسلوں میں سے ہے بعد کے آنے والے سلسلوں میں بہت زیادہ اثر کرے گا لہٰذا دنیا میں انقلابات کی دوسری وجوہات اور مقدمات اور ایسے ہی تہذیب وتمدن کی ترقی کا راز قرآن مجید ہی میں مضمر ہے۔

البتہ اس مسئلہ کو زیادہ واضح کرنے اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ تحقیق کی ضرورت ہے، لیکن اختصار کا طریقہ جو اس مضمون میں قابل توجہ رہا ہے، اس امر کی طرف توجہ دینے سے منع اور باز رکھتا ہے۔

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام

آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

نام ونسب:۔ ابومحمد کنیت، حسن نام اور سامرے کے محلۂ عسکر میں قیام کی وجہ سے عسکری مشہور لقب ہے۔

والد بزرگوار حضرت امام علی نقیؑ اور والدہ سلیل خاتون تھیں جو عبادت، ریاضت، عفت اور سخاوت کے صفات میں اپنے طبقے کے لئے مثال کی حیثیت رکھتی تھیں۔

ولادت:۔ ۱۰ ربیع الثانی ۲۳۲ھ مدینہ منورہ میں ولادت ہوئی۔

نشو ونما اور تربیت:۔ بچپن کے گیارہ سال تقریباً اپنے والد بزرگوار کے ساتھ وطن میں رہے جس کے لئے کہا جاسکتا ہے کہ یہ زمانہ اطمینان سے گذرا۔ اس کے بعد امام علی نقیؑ کو سفر عراق درپیش ہوگیا اور تمام متعلقین کے ساتھ ساتھ امام حسن عسکریؑ اسی کم سنی کے عالم میں سفر کی زحمتوں کو اٹھا کر سامرے پہنچے یہاں کبھی قید، کبھی نظر بندی اور کبھی کسی حد تک آزادی، مختلف دور سے گذرنا پڑا مگر ہر حال میں آپ اپنے بزرگ مرتبہ باپ کے ساتھ ہی ساتھ رہے۔ اس طرح باطنی اور ظاہری طور پر ہر حیثیت سے آپ کو اپنے والد بزرگوار کی تربیت اور تعلیم سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا موقع مل سکا۔

زمانۂ امامت:۔ ۲۵۴ھ میں آپ کی عمر بائیس برس کی تھی جب آپ کے والد بزرگوار حضرت امام علی نقیؑ کی وفات ہوئی حضرت نے اپنی وفات سے چار مہینہ قبل آپ کے متعلق اپنے وصی و جانشین ہونے کا اظہار فرما کر اپنے اصحاب کی گواہیاں لے لی تھیں۔ اب امامت کی ذمہ داریاں امام حسن عسکریؑ کے متعلق ہوئیں جنھیں آپ باوجود انتہائی شدید مشکلات اور سخت ترین ماحول کے ادا فرماتے رہے۔

سلاطین وقت اور ان کا رویہ:۔ جیسا کہ اس کے پہلے ضمناً بیان ہوا کہ امام حسن عسکریؑ کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ ان تمام تکالیف اور مصائب میں بھی شریک رہے جو آپ کے والد بزرگوار کو حراست اور نظر بندی کے ذیل میں متعدد بار برداشت کرنا پڑے۔ اس کے بعد جب آپ کا دور امامت شروع ہوا ہے تو سلطنت بنی عباس کے تخت پر معتز باللہ عباسی کا قیام تھا۔ معتز کی معزولی کے بعد مہتدی کی سلطنت ہوئی۔ گیارہ مہینے چند روز حکومت کرنے کے بعد اس کا خاتمہ ہوا اور معتمد کی حکومت قائم ہوئی ان میں سے کوئی ایک بادشاہ بھی ایسا نہ تھا جس کے زمانہ میں امام حسن عسکریؑ کو آرام وسکون ملتا باوجودیکہ اس وقت سلطنت بنی عباس بڑی سخت الجھنوں اور پیچیدگیوں میں گرفتار تھی۔ مگر ان تمام سیاسی مسائل اور مشکلات کے ساتھ ہر حکومت نے امام حسن عسکریؑ کو قید و بند میں رکھنا سب سے زیادہ ضروری سمجھا اس کا خاص سبب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث تھی کہ میرے بعد بارہ جانشین ہوں گے اور ان میں سے آخری مہدی آخرالزماں اور قائم آل محمدؐ ہوگا۔ یہ

حدیث برابر متواتر طریقہ سے عالم اسلام میں گردش کرتی رہی تھی۔

خلفائے بنی عباس خوب جانتے تھے کہ سلسلۂ آل محمدؐ کے وہ افراد جو رسول کی صحیح جانشینی کے مصداق ہوسکتے ہیں وہ یہی افراد ہیں جن میں سے گیارہویں ہستی امام حسن عسکریؑ کی ہے اس لئے ان ہی کا فرزند وہ ہوسکتا ہے جس کے بارے میں رسولؐ کی پیشین گوئی صحیح قرار پاسکے۔ لہٰذا کوشش یہ تھی کہ ان کی زندگی کا دنیا سے خاتمہ ہو جائے اس طرح کہ ان کا کوئی جانشین دنیا میں موجود نہ ہو یہ سبب تھا کہ امام حسن عسکریؑ کے لیے اس نظر بندی پر اکتفا نہیں کی گئی جو امام علی نقیؑ کے لیے ضروری سمجھی گئی تھی بلکہ آپ کے لئے اپنے گھر بار سے الگ قید تنہائی کو ضروری سمجھا گیا یہ اور بات ہے کہ قدرتی انتظام کے ماتحت درمیان میں انقلاب سلطنت کے وقفے آپ کی قید مسلسل کے بیچ میں قہری رہائی کے سامان پیدا کر دیا کرتے تھے مگر پھر بھی جو بادشاہ تخت سلطنت پر بیٹھتا تھا وہ اپنے پیش رو کے نظریہ کے مطابق آپ کو دوبارہ مقید کرنے پر تیار ہو جاتا تھا اس طرح آپ کی مختصر زندگی جو دور امامت کے بعد تھی اس کا بیشتر حصہ قید و بند ہی میں گذرا۔

اس قید کی سختی معتمد کے زمانے میں بہت بڑھ گئی تھی اگر چہ وہ مثل دیگر ظالم سلاطین کے آپ کے مرتبہ اور حقانیت سے خوب واقف تھا چنانچہ جب قحط کے موقع پر ایک عیسائی راہب کے دعوے کے ساتھ پانی برسانے کی وجہ سے مسلمانوں میں ارتداد کا فتنہ برپا ہوا اور لوگ عیسائیت کی طرف دوڑنے لگے تو مسلمانوں کو گمراہی سے بچانے کے لیے وہ امام حسن عسکریؑ ہی تھے جو قید خانے سے باہر لائے گئے آپ نے مسلمانوں کے شکوک کو دور کر کے انھیں اسلام کے جادہ پر قائم رکھا اس واقعہ کا اتنا اثر ہوا کہ اب معتمد کو آپ کے پھر اسی قید خانے میں واپس کرنے میں خجالت دامن گیر ہوئی اس لئے آپ کی قید کو آپ کے گھر میں نظر بندی کے ساتھ تبدیل کر دیا گیا مگر آزادی پھر بھی نصیب نہ ہوسکی۔

سفراء کا تقرر:۔ ائمہ اہلبیتؑ جس حال میں بھی ہوں ہمیشہ کسی نہ کسی صورت سے امامت کے فرائض کو انجام دیتے رہتے تھے۔ امام حسن عسکریؑ پر اتنی شدید پابندیاں عائد تھیں کہ علوم اہلبیت کے طلبگاروں اور شریعت جعفری کے مسائل دریافت کرنے والوں کا آپ تک پہنچنا کسی صورت سے ممکن نہ تھا۔ اسلئے حضرت نے اپنے زمانہ میں یہ انتظام کیا کہ ایسے افراد جو امانت و دیانت نیز علمی و فقہی بصیرت کے اس درجہ حامل تھے کہ امام کے محل اعتماد ہوسکیں انہیں اپنی جانب سے آپ نے نائب مقرر کر دیا تھا یہ حضرات جہاں تک کہ خود اپنے واقفیت کے حدود میں دیکھتے تھے اس حد تک مسائل خود ہی بتا دیتے تھے اور وہ اہم مسائل جو ان کی دسترس سے باہر ہوتے تھے انہیں اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے اور کسی مناسب موقع پر امام کی خدمت میں رسائی حاصل کر کے ان کو حل کرا لیتے تھے کیونکہ ایک شخص کا کبھی کبھی امام سے ملاقات کو آجانا حکومت کے لئے اتنا ناقابل برداشت نہیں ہوسکتا تھا جتنا کہ عوام کی جماعتوں کا مختلف اوقات میں حضرت تک پہنچنا۔

ان ہی سفراء کے ذریعہ سے ایک اور اہم خدمت بھی انجام پاتی تھی، وہ یہ کہ خمس جو حکومت الٰہیہ کے نمائندہ ہونے کی

حیثیت سے اس نظام حکومت کو تسلیم کرنے والے ہمیشہ ائمہ معصومینؑ کی خدمت میں پہنچاتے رہے اور ان بزرگوں کی نگرانی میں وہ ہمیشہ دینی امور کے انصرام اور سادات کی تنظیم و پرورش میں صرف ہوتا رہا اب وہ رازدارانہ طریقہ پر ان ہی نائبوں کے پاس آتا تھا اور یہ امام علیہ السلام سے ہدایات حاصل کر کے انھیں ضروری مصارف میں صرف کرتے تھے یہ افراد اس حیثیت سے بڑے سخت امتحان کی منزل میں تھے کہ ان کو ہر وقت سلطنت وقت کے جاسوسوں کی سراغ رسانی کا اندیشہ رہتا تھا۔اسی لئے عثمان بن سعید اور ان کے بیٹے ابوجعفر محمد بن عثمان نے جو امام حسن عسکریؑ کے ممتاز نائب تھے اور عین دار السلطنت بغداد میں مقیم تھے اپنے پاس متعلقہ افراد کی آمد ورفت کو حق بجانب قرار دینے کے لئے ایک بڑی دوکان روغنیات کی کھول لی تھی اس طرح حکومت جور کے شدید شکنجۂ ظلم کے اندر بھی حکومت الٰہیہ کا آئینی نظام چل رہا تھا اور حکومت کا کچھ بس نہ چلتا تھا۔

اخلاق و اوصاف :۔آپ اسی سلسلۂ عصمت کی ایک کڑی تھے جس کا ہر حلقہ انسانی کمالات کے جواہر سے مرصع تھا۔علم وحلم ، عفو وکرم ، سخاوت وایثار سب ہی اوصاف بے مثال تھے عبادت کا یہ عالم تھا کہ اس زمانے میں بھی کہ جب آپ سخت قید میں تھے معتمد نے جس سے آپ کے متعلق دریافت کیا یہی معلوم ہوا کہ آپ دن بھر روزہ رکھتے ہیں اور رات بھر نمازیں پڑھتے ہیں اور سوا ذکرالٰہی کے کسی سے کوئی کلام نہیں فرماتے اگر چہ آپ کو اپنے گھر پر آزادی کی سانسیں لینے کا موقع بہت ہی کم ملا پھر بھی جتنے عرصہ تک قیام رہا دور دراز سے لوگ آپ کے فیض وعطا کے تذکرے سن کر آتے تھے اور بامراد واپس جاتے تھے۔آپ کے اخلاق واوصاف کی عظمت کا عوام وخواص سب ہی کے دلوں پر سکہ قائم تھا ۔چنانچہ جب احمد بن عبداللہ بن خاقان کے سامنے جو خلیفۂ عباسی کی طرف سے شہر قم کے اوقاف وصدقات کے شعبہ کا افسر اعلیٰ تھا، سادات علوی کا تذکرہ آگیا تو وہ کہنے لگا کہ مجھے کوئی حسن عسکریؑ سے زیادہ بلند مرتبہ اور علم و ورع، زہد وعبادت ، وقار وہیبت ، حیاوعفت ، شرف وعزت اور قدر ومنزلت میں ممتاز اور نمایاں نہیں معلوم ہوا۔اس وقت جب امام علی نقیؑ کا انتقال ہوا اور لوگ تجہیز وتکفین میں مشغول تھے تو بعض گھر کے ملازمین نے اثاث البیت وغیرہ میں سے کچھ چیزیں غائب کر دیں اور انھیں خبر نہ تھی کہ امام کو اس کی اطلاع ہو جائے گی ۔جب تجہیز وتکفین وغیرہ سے فراغت ہوئی تو آپ نے ان نوکروں کو بلایا اور فرمایا کہ جو کچھ پوچھتا ہوں اگر تم مجھ سے سچ سچ بیان کردوگے تو میں تمھیں معاف کردوں گا اور سزا نہ دوں گا لیکن اگر غلط بیانی سے کام لیا تو پھر میں تمھارے پاس سے سب چیزیں برآمد بھی کرالوں گا اور سزا بھی دونگا اس کے بعد آپ نے ہر ایک سے ان اشیاء کے متعلق جو اس کے پاس تھیں دریافت کیا اور جب انھوں نے سچ بیان کر دیا تو ان تمام چیزوں کو ان سے واپس لے کر آپ نے ان کو کسی قسم کی سزا نہ دی اور معاف فرمادیا۔

علمی مرکزیت :۔باوجودیکہ آپ کی عمر بہت مختصر ہوئی یعنی صرف اٹھائیس برس مگر اس محدود اور مشکلات سے بھری ہوئی زندگی میں بھی آپ کے علمی فیوض کے دریا نے

بڑے بڑے بلند پایہ علماء کو سیراب ہونے کا موقع دیا نیز اس زمانہ کے فلاسفہ کا جو دہریت اور الحاد کی تبلیغ کر رہے تھے مقابلہ فرمایا جسمیں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ان میں سے ایک اسحٰق کندی کا واقعہ ہے کہ یہ شخص قرآن مجید کے آیات کے باہمی تناقض کے متعلق ایک کتاب لکھ رہا تھا یہ خبر امام حسن عسکریؑ کو پہونچی اور آپ موقع کے منتظر ہو گئے اتفاق سے ایک روز ابو اسحٰق کے کچھ شاگرد آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ تم میں کوئی اتنا سمجھدار آدمی نہیں ہے جو اپنے استاد کندی کو اس فضول مشغلے سے روکے جو انھوں نے قرآن کے بارے میں شروع کر رکھا ہے، ان طلاب نے کہا حضور ہم تو ان کے شاگرد ہیں ہم بھلا ان پر کیا اعتراض کر سکتے ہیں۔

حضرت نے فرمایا اتنا تو تم کر سکتے ہو جو کچھ باتیں میں تمھیں بتاؤں وہ تم ان کے سامنے پیش کردو۔ طلاب نے کہا جی ہم اتنا کر سکتے ہیں۔

حضرت نے کچھ آیتیں قرآن کی جن کے متعلق باہمی اختلاف کا توہم ہو رہا تھا پیش فرما کر ان سے کہا کہ تم اپنے استاد سے اتنا پوچھو کہ کیا ان الفاظ کے بس یہی معنی ہیں جن کے لحاظ سے وہ تناقض ثابت کر رہے ہیں اور اگر کلام عرب کے شواہد سے دوسرے متعارف معنی نکل آئیں جن کی بناء پر الفاظ قرآن میں باہم کوئی اختلاف نہ رہے تو پھر انھیں کیا حق ہے کہ وہ اپنے ذہنی خود ساختہ معنی کو متکلم قرآنی کی طرف منسوب کر کے تناقض و اختلاف کی عمارت کھڑی کریں۔ اس ذیل میں آپ نے کچھ شواہد کلام عرب کے بھی ان طلاب کو ذہن نشین کرائے ذہین طلاب نے وہ پوری بحث اور شواہد کے حوالے محفوظ کر لیے اور اپنے استاد کے پاس جا کر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد یہ سوالات پیش کر دیے آدمی بہر حال وہ منصف مزاج تھا اس نے طلاب کی زبانی وہ سب کچھ سنا اور کہا کہ یہ باتیں تمھاری قابلیت سے بالاتر ہیں سچ سچ بتانا کہ یہ تمھیں معلوم کہاں سے ہوئیں پہلے تو ان طالب علموں نے چھپانا چاہا اور کہا کہ یہ چیزیں خود ہمارے ذہن میں آئی ہیں مگر جب اس نے سختی کے ساتھ انکار کیا کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا تو انھوں نے بتا دیا کہ ہمیں ابومحمد حسن عسکریؑ نے یہ باتیں بتائی ہیں یہ سن کر اس نے کہا کہ سوا اس گھرانے کے اور کہیں سے یہ معلومات حاصل ہی نہیں ہو سکتے تھے پھر اس نے آگ منگوائی اور جو کچھ لکھا تھا وہ نذر آتش کر دیا۔

ایسے کتنے ہی علمی اور دینی خدمات تھے جو خاموشی کے ساتھ اپنا فرض سمجھ کر انجام پا رہے تھے اور حکومت وقت جو محافظت اسلام کی دعویدار تھی اپنے عیش و طرب کے نشے میں مدہوش تھی یا پھر چونکتی بھی تھی تو ایسے مخلص حامی اسلام کی طرف سے اپنی سلطنت کے لئے خطرہ محسوس کر کے ان پر کچھ پابندیاں بڑھا دیئے جانے کے احکام نافذ کرتی تھی مگر اس کوہ گراں کے صبر و استقلال میں فرق نہ آتا تھا۔

جوامع حدیث میں محدثین اسلام نے آپ کی سند سے احادیث نقل کی ہیں ان میں سے ایک خاص حدیث شراب خواری سے متعلق ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ ''شَارِبُ الْخَمْرِ کَعَابِدِ الْوَثَنِ'' شراب پینے والا مثل بت پرست

کے ہے۔

اس کو ابن الجوزی نے اپنی کتاب ''تحریم الخمر'' میں سند متصل کے ساتھ درج کیا ہے اور ابونعیم فضل بن وکیل نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ثابت ہے جس کی اہلبیت طاہرینؑ نے روایت کی ہے اور صحابہ میں سے ایک گروہ نے بھی اس کی رسو ل خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے جیسے ابن عباس، ابو ہریرہ، انس، عبد اللہ بن اوفی اسلمی اور دوسرے حضرات۔

سمعانی نے کتاب الانساب میں لکھا ہے کہ ''ابومحمد احمد بن ابراہیم بن ہاشم طوسی بلاذری حافظ واعظ نے مکہ معظّمہ میں امام اہلبیت ابومحمد حسن بن علی بن محمد بن علی بن موسی الرضاؑ سے احادیث سن کر قلم بند کیے۔''

ان کے علاوہ حضرت کے تلامذہ میں سے چند باوقار ہستیوں کے نام درج ذیل ہیں جن میں سے بعض نے حضرت کے علمی افادات کو جمع کر کے کچھ کتابیں بھی تصنیف کیں۔

(۱) ابو ہاشم داؤد بن قاسم جعفری سن رسیدہ عالم تھے انھوں نے امام رضاؑ سے امام حسن عسکریؑ تک چار اماموں کی زیارت کی اور ان بزرگواروں سے فیوض بھی حاصل کیے، وہ امام علیہ السلام کی طرف سے نیابت کے درجہ پر فائز تھے۔ (۲) داؤد بن ابی زید نیشاپوری امام علی نقیؑ کے بعد امام حسن عسکریؑ کی صحبت سے شرفیاب ہوئے۔ (۳) ابو طاہر محمد بن علی بن بلال۔ (۴) ابوالعباس عبد اللہ بن جعفر حمیری قمی بڑے بلند پایہ عالم، بہت سی کتابوں کے مصنف تھے جن میں سے قرب الاسناد کتاب اس وقت تک موجود ہے اور کافی وغیرہ کے ماخذوں میں سے ہے۔ (۵) محمد بن احمد بن جعفر قمی حضرت کے خاص نائبین میں سے تھے۔ (۶) جعفر بن سہیل صیقل، یہ بھی نائب خاص ہونے کا شرف رکھتے تھے۔ (۷) محمد بن حسن صفار قمی بڑے مرتبہ کے عالم متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے بصائر الدرجات مشہور کتاب ہے انھوں نے امام حسن عسکریؑ کی خدمت میں تحریری مسائل بھیج کر ان کے جوابات حاصل کیے۔ (۸) ابوجعفر ہمانی برمکی، امام حسن عسکریؑ سے مسائل فقہیہ کے جوابات حاصل کر کے کتاب مرتب کی۔ (۹) ابراہیم بن ابی حفص ابو اسحٰق کاتب حضرت کے اصحاب میں سے ایک کتاب کے مصنف ہیں۔ (۱۰) ابراہیم بن مہزیار مصنف کتاب البشارات۔ (۱۱) احمد بن ابراہیم بن اسمٰعیل بن داؤد بن حمدان الکاتب الندیم علم لغت وادب کے مسلم استاد تھے اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے حضرت امام حسن عسکریؑ سے خاص خصوصیت رکھتے تھے (۱۲) احمد بن اسحٰق الاشعری ابوعلی القمی بڑے پایہ کے مستند ومسلم عالم تھے۔ ان کی تصانیف میں علل الصوم اور دیگر متعدد کتابیں تھیں۔

یہ چند نام بطور مثال درج کیے گئے اگر ان تمام افراد کا تذکرہ کیا جائے تو اس کے لیے مستقل تصنیف کی ضرورت ہے خصوصیت کے ساتھ تفسیر قرآن میں ابوعلی حسن بن خالد بن محمد بن علی برقی نے آپ کے افادات سے ایک ضخیم کتاب لکھی جسے حقیقت میں خود حضرت ہی کی تصنیف سمجھنا چاہیے یعنی حضرت بولتے جاتے تھے اور وہ لکھتے جاتے تھے۔ **بقیہ صفحہ ۳۱ پر**

ہجری تاریخ کا آغاز

حجۃ الاسلام جعفر مرتضیٰ عاملی مدظلہ

مورخین کے مطابق سن ہجری کی بنیاد خلیفۂ دوم عمر بن خطاب نے رکھی تھی اور اکثر تاریخ نویسوں کا عقیدہ ہے کہ تاریخ کے لئے ہجری کا یہ انتخاب علیؑ کے اشارہ پر ہوا تھا۔

(احقاق الحق جلد ۸، ص ۲۲۰)

ایک دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ: فقط علیؑ نے یہ پیش کش نہیں کی بلکہ اصحاب کی ایک جماعت ان کے ساتھ اس کام میں شریک تھی۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۷ ص ۷۴)

اس سلسلہ میں ایک تیسری روایت ہے کہ اصحاب کی ایک جماعت نے یہ پیش کش تو کی لیکن یہاں پیش کش کرنے والے کے نام کا ذکر نہیں ہے۔

(کامل ابن اثیر جلد ۱ ص ۱۰)

چوتھے گروہ نے پیش کش کئے جانے کے ذکر سے گریز کیا ہے اور صرف اس ذکر پر اکتفا کیا ہے کہ سب سے پہلے تاریخ ہجری کے وضع کرنے والے عمر تھے۔

(طبری جلد ۳ ص ۲۷۷)

مورخین کا بیان

یہ واقعہ کیسے پیش آیا مورخین اس کو مندرجہ ذیل انداز میں نقل کرتے ہیں:۔

۱۔ ابن کثیر لکھتا ہے کہ واقدی نے اپنی کتاب میں کہا ہے کہ اس سال ربیع الاول میں (مراد ۱۶ ہجری ہے) عمر بن خطاب نے پہلی بار مبداء تاریخ کا تعین کیا ــــــ اس بات کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ــــــ اس کی وجہ یہ تھی کہ عمر کے پاس ایک سند لائی گئی جس میں قرض ادا کرنے کی تاریخ ماہ شعبان درج تھی، عمر نے پوچھا کہ کونسا شعبان، یہ شعبان یا آئندہ یا گذشتہ؟

اس کے بعد انھوں نے لوگوں (اصحاب پیغمبرؐ) کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ اس سلسلہ میں کچھ وضع کیجئے تا کہ اس کے ذریعہ لوگ اپنے قرض کی ادائیگی کے وقت سے واقف ہوجائیں ــــــ اس کے بعد مزید فرماتے ہیں کہ بعض افراد (ھرمزان ایرانی) نے کہا کہ اہل فارس کے انداز پر تاریخ معین کی جائے جس طرح اہل فارس اپنے بادشاہ کے آغاز سلطنت کو مبدأ تاریخ قرار دیتے تھے جب ان کا کوئی بادشاہ مر جاتا تھا تو اس کے بعد دوسرے آنے والے بادشاہ کے آغاز سلطنت کو تاریخ کا مبدأ قرار دیتے تھے۔

لیکن یہ پیش کش قبول نہیں کی گئی۔

(تاریخ ابن الوردی جلد ۱ ص ۱۴۵)

ان میں سے بعض لوگوں نے (وہ یہودی جو مسلمان ہوگئے تھے) کہا کہ اسکندر کے زمانہ سے تاریخ روم کو تاریخ کی شروعات قرار دی جائے۔ یہ پیش کش بھی طولانی ہونے کے باعث قبول نہیں کی گئی۔

(الاعلان بالتوبیخ ص ۸۱)

ایک تیسرے گروہ نے کہا کہ بعثت پیغمبرؐ کے سال کو تاریخ کا مبداء قرار دیا جائے۔

چوتھی جماعت نے کہا کہ پیغمبرؐ کی ولادت کے سال سے تاریخ شروع کی جائے۔

امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام آخری شخص تھے جنھوں نے مشورہ دیا کہ مکہ سے مدینہ ہجرت والے سال کو مبدأ تاریخ قرار دیا جائے اس لئے کہ یہ واقعہ تمام لوگوں کو معلوم ہے۔ درحقیقت ہجرت پیغمبرؐ کی تاریخ ولادت اور بعثت کی تاریخوں سے زیادہ واضح تھی۔

جناب عمر اور اصحاب نے اس مشورہ کو قبول کیا اور عمر نے حکم دیا کہ سال ہجرت، مبدأ تاریخ قرار پائے۔

(تاریخ عمر ابن خطاب بقلم ابن جوزی ص ۷۵،۷۶)

۲۔ حاکم نیشاپوری اس بات کو صحیح سمجھتے ہیں اور اس کو اپنی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں۔ اسی طرح ذہبی، سعید ابن مسیب سے نقل کرتے ہیں کہ عمر نے لوگوں کو جمع کیا اور ان سے سوال کیا کہ کس دن سے تاریخ لکھی جائے؟ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ جس دن سے رسولؐ خدا نے ہجرت کی اور سرزمین شرک کو ترک فرمایا عمر نے بھی یہ کام کیا۔ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔ بخاری و مسلم نے اس کو نقل کیا ہے۔

۳۔ یعقوبی ۱۶ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں کہ: اس سال خطوط پر تاریخ ڈالی گئی اور یہ ارادہ کیا گیا کہ بعثت مبدأ تاریخ ہو۔ ایک دوسرے گروہ نے کہا کہ پیغمبرؐ کی ولادت کا سال مبدأ تاریخ ہونا چاہیئے۔ لیکن علیؑ نے یہ پیش کش رکھی کہ تاریخ، ہجرت رسولؐ خدا سے لکھی جائے۔

(تاریخ یعقوبی جلد ۲ ص ۱۴۵)

یہ تمام نظریات اس بات پر دلالت کر رہے ہیں کہ عمر وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسلامی تاریخ وضع کی۔

بہترین نظریہ

ہم کو اپنی جگہ اس نظریہ کی اصالت پر شک ہے اور ہمارا نظریہ یہ ہے کہ تاریخ، پیغمبرؐ کے زمانے میں وضع ہو گئی تھی اور پیغمبرؐ نے ایک بار سے زیادہ مختلف مناسبتوں سے سال ہجرت کو بنیاد بنا کر تاریخ معین کی ہے اور جو عمر کے زمانہ میں ہوا وہ فقط سال کی ابتدا کو ربیع الاول سے محرم میں تبدیل کر دیا گیا۔ دوسرے سال کو سال ہجری کا مبدأ قرار دیا گیا اور ماقبل کو حذف کر دیا گیا۔ یہ وہ بات ہے جس کو بیہقی نے نقل کیا ہے اور سفیان نسوی کا بھی یہی خیال ہے۔

(کامل ابن اثیر جلد ا ص ۱۰)

محرم کی تجویز کس نے پیش کی؟

سال کے آغاز کو ماہ ربیع الاول سے بدل کر محرم کر دینے کی پیش کش کس نے کی اس میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ عثمان بن عفان تھے (فتح الباری جلد ۷ ص ۲۰۹)

اور بعض نے کہا ہے کہ یہ خود عمر تھے (الوزراء والکتاب ص ۲۰)

ایک دوسرا گروہ کہتا ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوف نے ماہ رجب کی پیش کش رکھی علیؑ نے ان کے مقابل میں ماہ محرم کی تجویز پیش کی اور یہ تجویز قبول کر لی گئی۔

(احقاق الحق جلد ۸ ص ۲۲۰)

دیار بکری کا کہنا ہے کہ عمر نے خود یہ کام کیا اور بعد

میں علیؑ وعثمان نے یہ پیش کش رکھی۔

(تاریخ خمیس جلد ۱ ص ۲۲۸)

سخاوی اور دوسرے افراد کہتے ہیں کہ......ان تمام روایات اور اقوال سے واضح ہوتا ہے کہ تجویز رکھنے والے عمرو عثمان وعلیؑ تھے۔(فتح الباری جلد ۷ ص ۲۰۹، ۲۱۰)

عسکری کی اوائل جلد ۱ سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ چونکہ حرمت والے مہینے ایک کے بعد ایک پے در پے آتے ہیں اس لئے عمر نے ماہ محرم کو سال کی ابتداء قرار دیا لیکن ہم اس کو بعید سمجھتے ہیں کہ علیؑ نے اس کام میں کوئی حصہ لیا ہو بلکہ اس کے برعکس ہمارا عقیدہ ہے کہ انہوں نے یہ کام نہیں کیا اور پوری زندگی وہ ماہ ربیع الاول پر مصر رہے۔ یہ خیال اصحاب اور مسلمانوں کے ایک دوسرے گروہ کا بھی تھا۔ بعد کی سطروں میں ہم اس موضوع پر گفتگو کریں گے۔

۱۔جیسا کہ گذر چکا ہے کہ علیؑ نے تجویز پیش کی کہ مبداء تاریخ رسول اکرمؐ کی ہجرت کے دن یا اس دن کو قرار دیا جائے جس دن پیغمبرؐ نے سرزمین شرک کو ترک فرمایا۔ جیسا کہ ابن مسیب کی روایت اس پر دلالت کرتی ہے۔

۲۔جو عہد نامہ اہل نجران کا امیر المومنینؑ نے لکھا ہے اس میں مرقوم ہے کہ ''کَتَبَ عَبْدُاللہِ ابْنِ رَافِعِ لِعَشْرٍ خَلَوْنَ مِنْ جُمَادیٰ الْاٰخَرَۃُ سَنَۃَ سَبْعٍ وَثَلاثِیْنَ مُنْذُوَلَجَ رَسُوْلُ اللہِ الْمَدِیْنَۃَ'' عبداللہ بن رافع نے ۱۰ ر جمادی الآخر ے۳ھ کو لکھا۔ یہ اس دن سے ہے جس دن سے پیغمبرؐ مدینہ میں وارد ہوئے۔(الخراج بقلم ابو یوسف ص ۸۱)

۳۔سھیلی وغیرہ نے حکایت کی ہے کہ ـــــ مالک ابن انس کہتے ہیں کہ اول سال اسلامی ربیع الاول ہے اس لئے کہ یہ وہ مہینہ ہے جس مہینہ میں رسول خدا نے ہجرت کی۔(البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۲۰۷، جلد ۶ ص ۹۴)

۴۔سخاوی نے اصمعی اور زھری سے نقل کیا ہے کہ :ان لوگوں نے ربیع الاول سے جو ہجرت کا مہینہ ہے، تاریخ شروع کی۔(الاعلان بالتوبیخ لمن یذم التاریخ ص ۷۸)

۵۔صحابہ (مورخین نے بھی ان کی پیروی کی ہے) مہینوں کو ہجرت کے وقت یعنی ماہ ربیع الاول سے لے کر ہجرت کے پانچویں سال کے وسط تک شمار کرتے تھے......

اس تفصیل کے ساتھ جو آگے آئے گی۔

گذشتہ باتوں سے پتہ چلا کہ علیؑ نے سال کے پہلے مہینے کو ربیع الاول سے بدل کر محرم کر دینے کی تجویز نہیں پیش کی تھی۔ بلکہ علیؑ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے ماہ ربیع الاول کو سال کا پہلا مہینہ قرار دینے کے لئے اصرار کیا تھا۔ ربیع الاول وہی مہینہ ہے جس میں رسول خدا مکہ سے نکلے تھے یا اس مہینہ کے شروع میں وارد مدینہ ہوئے تھے۔

امیر المومنینؑ کی طرح بہت سے لوگ تھے جو اس تبدیلی پر راضی نہیں تھے لیکن ان کی رائے قبول نہیں کی گئی۔

یہاں یہ نکتہ یاد دلا دینا ضروری ہے کہ پیغمبرؐ کے مدینہ وارد ہونے کے دن کو مبداء تاریخ ہجری کے عنوان سے قرار دیے جانے کے بارے میں علیؑ کی تجویز اس بات کی مؤید ہے کہ پیغمبرؐ ربیع الاول کی پہلی تاریخ کو سرزمین مدینہ پر وارد ہوئے۔ اس سلسلہ میں دوسرے مطالب بھی آئیں گے اگر چہ وہ ہمارے اصلی مقصد اور نظریے سے متعلق نہیں ہیں لیکن جس

چیز کو ہم اہمیت دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ کس شخص نے ہجرت کو مبداء تاریخ قرار دیا؟ اگر چہ ہم معتقد ہیں کہ خود پیغمبرؐ نے اس کام کو انجام دیا اور اس کے دلائل درج ذیل ہیں۔

اس رائے سے موافقت کرنے والے

جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ بہت سے لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ عمر نے یہ کام کیا بعض افراد کو اس نظریہ پر شک ہے اور وہ اس کی تردید کرتے ہیں اور بعض افراد اس کے موافق ہیں اور اسی مشہور نظریہ کی طرف میلان رکھتے ہیں۔

اس میلان کی وجہ مدارک سے ان کی عدم واقفیت ہے اگر حقیقت ان پر آشکار ہوتی تو مشہور نظریہ سے مقابلہ کرتے۔

بہر حال جو ہمارے نظریہ کے موافق ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

سید علی عباس کلی نزھۃ المجالس میں اس تفصیل کے ساتھ جو آئندہ آئے گی اور سیوطی اسے ابن صلاح سے اور وہ ابی جمش زیادی سے اس تفصیل کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔

صاحب مواہب فرماتے ہیں کہ رسولؐ خدا نے حکم دیا کہ تاریخ کی کتابت ہجرت کے وقت سے کی جائے۔

زرقانی فرماتے ہیں کہ حاکم نے اسے الاکلیل میں زہری سے مفصل روایت کی ہے۔ زرقانی کا کہنا ہے کہ مشہور اس روایت کے خلاف ہے جیسا کہ حافظ نے کہا ہے۔

(التراتیب الاداریہ جلد ۱ ص ۱۸۱)

او ر اس بات کو اصمعی وغیرہ سے نقل کیا ہے ابن عساکر کہتے ہیں کہ یہ صحیح تر ہے۔ سیوطی نے آئندہ تفصیلات کے ساتھ اس کی تائید کی ہے۔ (الشماریخ فی علم التاریخ سیوطی ص ۱۰)

مغلطائی اپنی سیرت ص ۳۵، ۳۶ پر فرماتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے ہجرت کے وقت سے کتابت تاریخ کا حکم دیا ابن جزار کہتے ہیں کہ سال ہجرت، سال اذن کے نام سے مشہور تھا۔ کہا جاتا ہے کہ عمر وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے تاریخ کا تعین کیا اور سال ہجرت کا پہلا مہینہ محرم قرار دیا اور ہجرت کے دس سال میں سے ہر سال ایک خاص نام کا حامل بنا۔ سال اول ہجرت کو سال اذن کا نام دیا گیا۔

(کتاب التنبیہ والاشراف مسعودی ملاحظہ ہو)

سہیلی کا بیان

سہیلی کا خیال ہے کہ تاریخ ہجری قرآن کے ذریعہ نازل ہوئی ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ نے سال ہجرت کو مبداء تاریخ کے عنوان سے نامزد کرنے کی موافقت کی۔ اگر یہ قرارداد قرآن پر مبنی ہوتی تو اس سے بہتر اور کیا استفادہ ہوسکتا تھا اور ہمارا گمان بھی یہی ہے کہ صحابہ نے قرآن سے استفادہ کرتے ہوئے اس کام کو انجام دیا اور اگر اجتہاد و رائے کی بنا پر بھی ہو تو اس سے بہتر اور کیا اجتہاد ہوسکتا ہے کہ قرآن نے جس کی پہلے سے تائید کر دی ہے......

خداوند عالم کے اس قول سے جو وہ قرآن میں ارشاد فرماتا ہے کہ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ: (سورۂ توبہ آیت ۱۰۸)

ترجمہ:۔ جس مسجد کی بنیاد اول روز سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے وہ اس لائق ہے کہ آپ اس میں اقامۂ نماز کریں۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے اس سے مراد ہر ہفتہ یا مہینہ یا سال کا پہلا دن مراد نہیں ہے جیسا کہ یہ بھی ظاہر نہیں ہے کہ کلمۂ یوم جس کی

طرف مضاف ہے وہ کون سا کلمہ ہے یہاں مضاف الیہ پوشیدہ ہے لہٰذا اگر کوئی بات کرنے والا یوں گفتگو کرے کہ ''اس نے پہلے روز کام کو انجام دیا'' تو یہ عاقلانہ بات نہیں ہے مگر یہ کہ ماہ و سال یا تاریخ اس کی معلوم ہو۔

کوئی قرینہ نہ تو حالیہ ہے اور نہ کوئی بات ایسی ہے جو اس لفظ مقدر (مضاف الیہ) پر دلالت کرے بس صرف وہی اول تاریخ ہے جس دن پیغمبرؐ مدینہ میں داخل ہوئے۔

اور وہ جو نحویین کہتے ہیں کہ ''مقدر'' من تاسیس اول یوم ہے اس لئے کہ کلمۂ من زمانہ پر جو 'اول' ہو وارد نہیں ہوتا۔۔۔۔ تو یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ نحویین کے قول کی بنا پر مجبوراً کہا جائے کہ ''من وقت تاسیس'' اور وقت کو مقدر مانا جائے۔ اس بنا پر فقط کلمۂ تاسیس کا مقدر ماننا فائدہ مند نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ کلمۂ ''من'' زمانہ پر وارد ہوتا ہے خداوند عالم قرآن میں ارشاد فرماتا ہے کہ ''مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ''

سہیلی کی بات یہاں پر تمام ہوئی (وفاء الوفاء جلد ۱ ص ۲۴۸)

کتانی نے بھی ایک بات کہی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: حافظ نے فتح الباری میں سہیلی کی گفتگو نقل کرنے کے بعد اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ۔۔۔۔ سہیلی یہ کہتے ہیں۔ اور جو بات ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے معنی اول یوم یہ ہے کہ ''اس دن جس دن پیغمبرؐ اور ان کے اصحاب مدینہ میں داخل ہوئے۔'' (فتح الباری جلد ۷ ص ۲۰۹)

لیکن ابن منیر کا خیال ہے کہ سہیلی نے آیت سے استفادہ کرنے میں اپنے کو زحمت میں ڈالا ہے اور آیت کے معنی بیان کرنے میں اس روش سے جو علماء گذشتہ کی روش تھی عدول کیا ہے (علماء گذشتہ کہتے تھے کہ ''من تاسیس اول یوم'' کا مطلب یہ ہے کہ اس دن سے جس دن تاسیس ہوتی ہے) درآں حالیکہ اس طرح کا معنی بیان کرنا عربی ادب کے قواعد و اسلوب کے مطابق ہے۔

کتانی کا کہنا ہے کہ ''جو بات سہیلی نے کہی ہے وہ بہت گہری نہیں ہے اور نہ ہی کسی مضبوط و محکم مدرک کی حامل ہے لیکن اگر صبر و ہمت سے غور و فکر کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اس کی بات درست ہے۔ اسی وجہ سے شہاب الدین خفاجی نے اپنی کتاب عنایۃ القاضی اور کفایۃ القاضی میں مؤلف مذکور کی بات کو آخر تک بیان کیا ہے اور اس طرح کے تمام اسناد کے ساتھ ذکر کیا ہے۔'' (التراتیب الاداریۃ جلد ۱ ص ۱۸۱، ۱۸۲)

یاقوت حموی کا کہنا ہے کہ اللہ کے قول ''من اول یوم'' سے مسجد قبا کا استفادہ کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ اس مسجد کا سنگ بنیاد اس دن رکھا گیا جس دن پہلی بار پیغمبرؐ سرزمین مدینہ پر وارد ہوئے 'وہی دن' تاریخ ہجری کی ابتداء کا دن ہے خدا جانتا تھا کہ جلد ہی وہ دن، تاریخ اسلامی کی شروعات کا دن قرار پائے گا اس لئے اس دن کا نام ۔۔۔ روز اول ۔۔ رکھا بعض علماء نے کہا ہے کہ اس جگہ مضاف حذف ہو گیا ہے اور کلمۂ ''تاسیس'' ہے۔ آیت کی یہ روش دوسری روش سے بہتر ہے۔ (معجم البلدان جلد ۵ ص ۱۲۴)

جو کچھ سہیلی سے منقول ہے بعینہ یہی ابن عباس سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے۔

(تنویر المقیاس حاشیۂ سر منثور جلد ۲ ص ۲۶۴)

اگر ان لوگوں کی بات درست ہو تو مناسب یہی

معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ نے ہر شخص سے پہلے خود ہی اس آیت کے مقتضاء پر عمل کیا ہو۔ یہ وہی بات ہے جو موجودہ حالت میں حاصل ہے جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں۔

جو کچھ سہیلی اور ان جیسے افراد نے کہا ہے اگر چہ ابتدائی دور کی بات نظر آتی ہے (لیکن) ہم جواب میں کہیں گے کہ یہ بات کم سے کم ان محتملات میں سے ہے جو آیت شریفہ کے معنی میں ہیں اگر چہ یقینی نہیں ہے۔ ہم نے اس کو اور تائید مطلب کے لئے ذکر کیا ہے، استدلال اور دلیل قائم کرنے کے لئے نہیں۔

ہماری دلیلیں

ہماری نظر میں پیغمبرؐ اکرم وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ہجرت کو تاریخ کا مبنیٰ قرار دیا ہے اور اسی دن سے تاریخ شروع کی ہے۔ ہماری دلیلیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ جو کچھ زہری سے نقل ہوا ہے وہ اس پر مبنی ہے کہ پیغمبرؐ جب مدینہ میں قدم رنجہ ہوئے تو انہوں نے اسی دن سے تاریخ لکھنے کا حکم صادر فرمایا اور یہ کام ماہ ربیع الاول میں ہوا۔ (فتح الباری جلد ۷ ص ۲۰۸)

دوسری روایت میں زہری سے منقول ہے کہ ''جس دن رسول خدا ہجرت کر کے مدینہ پہنچے اس دن سے تاریخ لکھی گئی۔'' (الشماریخ فی علم التاریخ ص ۱۰)

قلقشندی کا کہنا ہے کہ اس بنا پر ابتداء تاریخ اسلامی، سال ہجرت ہے۔ (صبح الاعشیٰ جلد ۶ ص ۲۴۰)

سابق میں، میں نے بعض مورخین کے اقوال نقل کئے ہیں اور آئندہ اس سلسلہ میں دلیلیں پیش کروں گا۔

عسقلانی وغیرہ نے اس حدیث کو فتح الباری وغیرہ میں غامض، پیچیدہ اور خلاف نظریۂ مشہور سمجھا ہے۔ جھشیاری نے کہا ہے کہ یہ شاذ ہے (الوزراء والکتاب ص ۲۵)

دیار بکری نے بھی اسی طرح کی بات کہی ہے۔

(تاریخ خمیس جلد ۱ ص ۳۳۸)

مسعودی نے جو بہت مشہور مورخ ہیں اس حدیث پر چار اعتراض کئے ہیں:

۱۔ یہ خبر واحد ہے اور نظر سے دور افتادہ ہے۔

۲۔ یہ حدیث مرسل ہے اور اس کو اس شخص نے نقل کیا ہے جو مراسیل کو قبول نہیں کرتا۔

۳۔ اس حدیث کے ناقل نے اس حدیث کو نقل کرنے سے پہلے کہا ہے کہ عمر تاریخ اسلامی کے موجد ہیں جنہوں نے علیؑ کی پیش کش پر اس کام کو انجام دیا جس پر سب نے اتفاق کیا ہے۔

۴۔ اس حدیث میں اس زمانہ کا پتہ نہیں چلتا جس وقت پیغمبرؐ نے تاریخ کی کتابت کا حکم فرمایا اور تاریخ اسلامی کی کتابت کی سرگذشت کا ذکر نہیں ہے۔ (التنبیہ الاشراف ص ۲۵۲)

مسعودی کے اعتراضات زہری کی حدیث پر وارد نہیں ہوتے اس لئے کہ حدیث کا مرسل یا خبر واحد ہونا اس کو الگ ہٹا دینے کی دلیل نہیں ہے بلکہ اس سے تمسک کرنا چاہیئے یہاں تک کہ اس شخص سے جو مراسیل کو قبول نہیں کرتا۔ اس لئے کہ دوسری روایتیں اس موضوع پر موجود ہیں جو آئندہ آئیں گی۔

۲۔ حاکم نیشاپوری نے عبداللہ بن عباس سے جو نقل

کیا ہے اور وہ اس کو صحیح جانتے ہیں وہ یہ ہے کہ جس سال پیغمبرؐ مدینہ میں تشریف لائے اسی سال تاریخ لکھی گئی یہ وہ سال ہے جس سال عبداللہ بن مسعود پیدا ہوئے۔

(مستدرک الحاکم جلد ۳ ص ۱۳، ۱۴)

۳۔سخاوی کہتے ہیں کہ اس بات میں اختلاف ہے کہ کس نے تاریخ کی شروعات کی ابن عساکر تاریخ دمشق میں انس بن مالک سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ تاریخ اس دن سے شروع ہوئی جس دن حضور نے مدینہ میں قدم رکھا اصمعی بھی فرماتے ہیں کہ ماہ ربیع الاول جو ہجرت کا مہینہ ہے اس سے تاریخ شروع ہوئی اس کے بعد زہری کی روایت نقل کرتے ہیں (الاعلان بالتوبیخ ص ۷۸)

اس کے بعد سب پر اعتراض کر کے لکھتے ہیں کہ یہ سب خبر صحیح اور مشہور کے مخالف ہے جس نے تاریخ کے لکھنے کا حکم دیا وہ عمر تھے اور اوّلِ سال ماہ محرم ہے نہ کہ ربیع الاول۔

مذکورہ شخص کا اعتراض مسعودی کے اعتراض کی طرح نادرست ہے جیسا کہ ابھی ہم دیکھیں گے......اس لئے کہ کسی روایت کا صرف مخالف قول مشہور ہونا اس کے بطلان کی دلیل نہیں ہے بلکہ اس صورت میں جب دلیل قطعی موجود ہو تو خبر مشہور سے عدول کرنا چاہیۓ۔

آئندہ ہم دوسری ایسی دلیلیں پیش کریں گے جس سے کسی طرح کا کوئی شک وشبہ نہ رہ جائے۔

۴۔اکثر مورخین کا یہ خیال ہے کہ رسول خدا نے ماہ ربیع الاول میں مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی زہری اور ان جیسے دوسرے افراد کہتے ہیں کہ ماہ ربیع الاول کی پہلی تاریخ کو آپ مدینہ پہنچے لیکن ابن اسحاق اور کلبی اس قول پر متفق ہیں کہ ربیع الاول کی ابتداء میں آپ نے مکہ سے ہجرت کی۔ ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ اسی مہینہ (ربیع الاول) کے شروع میں آپ غار سے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔

(الروض الانف جلد ۲ ص ۲۴۵)

اگر ہم اس بات کی تائید کے لئے کہ حضرت ماہ ربیع الاول کی ابتداء میں وارد مدینہ ہوئے حضرت علیؑ کی تحریر سے استفادہ کریں یعنی اس وقت سے جب پیغمبرؐ وارد مدینہ ہوئے اور ایک دوسرا قول بھی ہے آپ نے فرمایا کہ ''تاریخ اس وقت سے شروع کرو جب سے پیغمبرؐ نے سرزمین شرک کو ترک کر دیا۔'' ان جھمیلوں سے بچنے کا راستہ یہ ہے کہ ہم کہیں کہ وہ لوگ یہ چاہتے تھے کہ ہم اس سال کو بعنوان مبداء تاریخ منتخب کریں جس میں مذکورہ بالا اقوال سے کسی طرح کا کوئی تضاد نہ ہو۔اہم مسئلہ یہ ہے کہ یہ ربیع الاول میں ہوا تھا......اگر ہم ان باتوں کو پیش نظر رکھیں جو ہم نے اصمعی، مالک اور زہری سے نقل کی ہیں اور اس مفہوم کو مورد استفادہ قرار دیں جو امیر المومنین سے ماہ ربیع الاول کے بارے میں کتابوں میں موجود ہے تو پھر ہم مطمئن ہو جائیں گے کہ تاریخ ہجری عمر کے زمانہ سے پہلے وضع ہوئی ہے۔عمر نے جو کام کیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے اولِ سال، ماہ محرم کو قرار دیا۔

اس موضوع کی تائید کے لئے مندرجہ ذیل قضیہ کو یاد کیا جا سکتا ہے اصحاب ماہ ربیع الاول سے ــــ جس میں پیغمبرؐ نے ہجرت کی ــــ مہینوں کی مدت شمار کیا کرتے تھے اور یہ روش ہجرت کے پانچویں سال کے وسط تک جاری رہی۔

۞ ابوسعید خدری فرماتے ہیں کہ ماہ رمضان کے واجب روزے کا حکم تحویل قبلہ (بیت المقدس سے کعبہ کی جانب) جو ماہ شعبان میں ہوا تھا کے ایک مہینہ کے بعد اللہ کی جانب سے آیا۔ یہ ہجرت کے ٹھیک ۱۸ مہینہ گذرنے کے بعد کا واقعہ ہے۔ (تاریخ الخمیس جلد ا ص ۳۶۸)

۞ عبداللہ بن انیس، سفیان بن خالد کی سرکردگی میں ہونے والے سریہ کے بارے میں مدینہ سے نکلنے کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ ''ہم لوگ محرم کی پانچویں تاریخ کو ہجرت سے ٹھیک ۵۴ ماہ بعد مدینہ سے نکلے۔''

۞ محمد بن سلمہ غزوۂ قرطاء کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''ہم لوگ دسویں محرم کی رات کو نکلے اور ۱۹ راتیں ہم لوگوں نے وہاں گذاریں اور محرم کی ایک رات باقی تھی تو واپس لوٹے۔ ٹھیک ہجرت کے ۵۵ مہینہ بعد (مغازی الواقدی جلد ۲ ص ۵۳۱، ۵۳۴)''

ہجرت کے پانچویں سال کے وسط سے مہینوں کے ذریعہ اسلامی تاریخ ہجری کا شمار شروع ہوتا ہے جو سلمہ بن الاکوع اور خالد بن ولید اور دوسرے تمام افراد کی گفتگو میں واضح طور پر نظر آتا ہے (صفوۃ الصفوۃ جلد ا ص ۶۵۲)

یہ صحابہ کی روش تھی جس پر بعد میں مورخین بھی چلے ہیں۔ (طبقات ابن سعد جلد ۲ قسم)

اس روش سے پتہ چلتا ہے کہ تاریخ ہجرت کے پہلے سال ہی وضع ہوگئی تھی۔ ورنہ اس کے کوئی معنی نہیں کہ ایک شخص سے اس واقعہ کے بارے میں پوچھا جائے جو پانچویں سال اس کو پیش آیا تھا تو وہ اس کو بتانے سے گریز کرے اور پھر گننا شروع کرے اور ریاضی کے عمل کی الجھنوں میں پڑے جو محتاج غور وفکر ہے پھر تھوڑی دیر کے بعد جواب دے وہ بھی مہینوں کو گن گن کر۔ لیکن یہ اس صورت میں تو ٹھیک ہے جب ایسی چیزوں میں اس کو ملکہ پیدا ہو گیا ہو اور ملکہ ایک دن میں پیدا نہیں ہوتا۔ صحابہ کے اس کام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ماہ ربیع الاول کو بعنوان آغاز ہجرت سمجھتے تھے لیکن بعد میں ان کے اختیار سے خارج ہو گیا۔

۵۔ وہ نص جو حضرت رسولؐ خدا نے جناب سلمان فارسی کے عہد نامہ کے لئے لکھا ہے اس میں تحریر کا زمانہ ۹ ہجری درج ہے۔

ابونعیم حسن بن ابراہیم بن اسحٰق برجی مستملی نقل کرتے ہیں اور وہ بھی محمد بن احمد بن عبدالرحمٰن سے روایت کرتے ہیں کہ ابوعلی حسین بن محمد بن عمرو وثابی سے سنا ہے کہ انہوں نے کہا کہ یہ سند شیراز میں غسان بن زادان بن شاذویہ بن ماہ بنداز برادر سلمان سے نقل کیا ہے۔

اور یہ عہد نامہ حضرت علیؑ کی تحریر میں حضرت خاتم النبیینؐ کی مہر کے ساتھ اصلی نسخہ کی رو سے تحریر تھا:

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ :هٰذَا كِتَابٌ مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ سَأَلَ سَلْمَانُ وَصِيَّةً بِاَخِيْهِ ماه بنداز وَ اَهْلِ بَيْتِهٖ وَ عَقَبِهٖ...ثُمَّ سَاقَ اَبُوْ نَعِيْمٍ اَلْكِتَابَ اِلٰى اَنْ قَالَ فِيْ آخِرِهٖ وَ كَتَبَ عَلِيُّ بْنُ اَبِيْطَالِبٍ بِاَمْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ فِيْ رَجَبٍ سَنَةَ تِسْعٍ مِنَ الْهِجْرَةِ وَحَضَرَ اَبُوْبَكْرٍ وَ عُمَرُ وَ عُثْمَانُ وَ طَلْحَةُ وَ زُبَيْرُ وَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ وَ سَعْدُ وَ سَعِيْدُ وَسَلْمَانُ وَ

اَبُوْ ذَرٍّ وَ عَمَّارُ وَ عُيَيْنَةُ وَ صُهَيْبُ وَ بِلَالُ وَ الْمِقْدَادُ وَ جَمَاعَةُ آخَرُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ . . .

خدائے رحمٰن ورحیم کے نام سے یہ خط محمد رسولؐ اللہ کی طرف سے سلمان کی طرف...... اس کے بعد ابونعیم اس خط کو آگے بڑھاتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ اس کو علی بن ابیطالبؑ نے رجب ۹ ہجری میں تحریر فرمایا ہے۔ جب ابو بکر، عمر، عثمان، طلحہ، زبیر، عبدالرحمٰن، سعد، سلمان، ابوذر، عینیہ، صھیب، بلال، مقداد اور مومنین میں سے دوسرے افراد موجود تھے۔

اس سند کو ابومحمد بن حیان نے ان افراد سے جو اس مسئلہ میں بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں اس خط کی خصوصیات کے ذکر کے ساتھ اور سلمان کے خاندان کے ان افراد کے تذکرہ کے ساتھ جنہوں نے ان سے بیان کیا نقل فرمایا ہے۔ سلمان فارسی کے خاندان کے افراد جن میں سب سے بزرگ عنسان بن زادان تھے یہ لوگ شیراز میں زندگی بسر کرتے تھے ان کے پاس رسولؐ خدا کا ایک خط حضرت علیؑ کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود تھے۔ دباغت کئے ہوئے سفید چمڑے کے خط کے آخر میں حضرت رسول خدا کی مہر تھی اور ابوبکر و علیؑ کا ذکر تھا۔ اس عہد نامہ کو جو انہوں نے نقل فرمایا ہے اس میں سند کا ایک ایک حرف موجود ہے بس اس میں یہ لکھا ہے کہ عینیہ کا نام نہیں لکھا ہے۔ (اخبار اصفہان ابی نعیم جلد ۱ ص ۵۲، ۵۳)

۶۔ مشہور مورخ بلاذری نے پیغمبرؐ کے اس خط کو بعینہ نقل کیا ہے جو حضرتؐ نے سرزمین مقنا و بنی حبیبہ کے یہودیوں کے لئے لکھا ہے۔ اس خط میں یہودیوں کے ساتھ معاہدہ کا ذکر اس طرح ہے کہ: شکاری پرندوں سے حاصل شدہ آمدنی کا ۱/۴ اور بنکاری کے آلات سے حاصل شدہ آمدنی کا ۱/۴، پھلوں اور زرہوں کی آمدنی کا ۱/۴، ہتھیاروں اور گھوڑوں کی آمدنی کا ۱/۴ یہودی آنحضرتؐ کو جو سرپرست مسلمین ہیں دیا کریں۔

بلاذری کہتے ہیں کہ اہل مصر میں سے ایک شخص نے مجھ سے بیان کیا کہ اس نے ایک لال رنگ کی جلد میں جس کے خطوط مٹ گئے تھے اس خط کو دیکھا اور اسی سے اس نے یہ نسخہ لیا اس کے بعد اس شخص نے ہم کو املاء کرایا اور ہم نے لکھا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ: مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ اِلٰى بَنِىْ حَبِيْبَةِ وَ اَهْلِ مُقْنَا، سِلْمٌ اَنْتُمْ وَ لَكُمْ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَ ذِمَّةُ رَسُوْلِ . . . ثُمَّ سَاقَ الْبَلَاذِرِىُ الْكِتَابَ اِلٰى اَنْ قَالَ فِىْ آخِرِهٖ :وَ لَيْسَ عَلَيْكُمْ اَمِيْرٌ اِلَّا مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ مِنْ اَهْلِ بَيْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ كَتَبَ عَلِىُّ بْنُ اَبِيْطَالِبٍ فِىْ سَنَةِ تِسْعٍ۔

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے، یہ خط محمد رسولؐ خدا کی طرف سے بنی حبیبہ اور اہل مقنا کی طرف ہے۔ تم لوگوں کو امان ہے خدا کی طرف سے اور ہماری طرف، مجھ کو خبر ملی ہے کہ تم لوگ اپنے قریہ کی طرف واپس لوٹ رہے ہو، جس وقت ہمارا خط تم کو ملے تو امن و امان میں ہو اور خدا اور اس کے رسولؐ کا عہد تم پر ہے۔

اس کے بعد بلاذری خط کے آخری حصہ تک نقل کرتا

ہے خط کے آخری حصہ میں یہ عبارت آئی ہے کہ ''تمہارے اوپر خود تمہارے علاوہ یا خاندان رسولؐ خدا کے علاوہ کوئی امیر نہیں ہے علی بن ابیطالب نے اس کو ۹ ہجری میں لکھا ہے۔'' (فتوح البلدان بلاذری ص ۶۷)

محمد بن احمد عساکر نے اس خط پر جو بلاذری نے فتوح البلدان میں نقل کیا ہے، دو اعتراضات کئے ہیں:

۱۔ علیؑ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے علم نحو کو لباس وجود پہنایا ہے تاکہ وہ نبطی کلام سے مخلوط نہ ہو جائے لہٰذا ان سے ممکن نہیں کہ وہ ایسی غلط انداز (نحوی غلطی) کی عبارت لکھیں اور ''علی بن ابوطالب'' میں ابو کو مرفوع لکھیں۔

۲۔ پیغمبرؐ نے اہل مقنا سے غزوۂ تبوک میں صلح کی ہے — جیسا کہ فتوح البلدان میں مذکور ہے اور علی بن ابی طالب اس جنگ میں شریک نہیں تھے تو یہ کہنا کہ اس خط کو علیؑ نے لکھا ہے خلاف عقل نہیں ہے؟ (فتوح البلدان حاشیہ ص ۶۷)

علامہ محقق علی احمدی نے ابن عساکر کا جو جواب دیا ہے، ہم یہاں اسی اکتفا کرتے ہیں اور اس کے جواب کا خلاصہ نقل کرتے ہیں۔

۱۔ پہلے اعتراض کا جواب

ملا علی قاری ''شفاء قاضی عیاض'' کی شرح میں نوادر ابی زید اصمعی سے نقل کرتے ہیں اور وہ یحییٰ بن عمر سے نقل کرتے ہیں اگر لفظ ''اب'' کسی کی کنیت ہو تو قریش اس کو بدلتے نہیں، بلکہ ہمیشہ مرفوع ہی پڑھتے ہیں نصب و جر و رفع تینوں حالت میں......

نہایہ ابن اثیر اور شرح قاری میں کلمۂ (ابی) کے بارے میں لکھا ہے کہ پیغمبرؐ نے مہاجر بن ابی امیہ کو لکھا کہ ''اَلْمُھَاجِرُ ابْنُ اَبِیْ اُمَیَّۃِ'' اور اس کے بعد اضافہ فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ ابوامیہ اپنی کنیت سے مشہور تھا اس کے علاوہ اس کا کوئی اور نام نہیں تھا۔ رسول اکرمؐ نے اسی نام کو استعمال کیا ہے۔ ملا علی قاری، ابن عساکر کے اشکال کو رفع کرنے کے لئے اس بات کو نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''اسی طرح علی ابن ابوطالب کہا جاتا ہے۔''

مجموعۂ وثائق السیاسہ میں صفدری سے منقول ہے کہ ''بعض افراد'' علی ابن ابو طالب لکھتے تھے اور ''علی ابن ابی طالب'' پڑھتے تھے۔ اس نکتہ کے بعد مجموعۂ وثائق السیاسیہ نے ''التراتیب الاداریہ'' سے وہ بات نقل کی ہے جو نوادر اصمعی سے نقل ہوئی ہے اور اسکی اہم ترین بات جس کا انہوں نے اضافہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ — ''قابل توجہ بات یہ ہے کہ جب محرم ۱۳۵۸ ہجری قمری میں میں مدینۂ منورہ گیا ہوا تھا اس وقت میں نے ایک نوشتہ دیکھا جس میں لکھا ہوا تھا ''اَنَا عَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ'' اور احتمال اس بات کا ہے کہ یہ علی بن ابی طالب کی لکھی ہوئی تحریر ہے۔''

مؤلف کتاب مجموعہ الوثائق السیاسہ مزید تحریر فرماتے ہیں کہ انہوں نے کلمۂ علی بن ابوطالب واؤ کے ساتھ چار قراءت شدہ خطوں میں شیوخ سے دیکھا ہے۔

اس جگہ پر ہم مزید بیان کرتے ہیں کہ ''مغلطائی اپنی سیرت کے ص ۱۰ پر فرماتے ہیں کہ ان کا نام ان کی کنیت تھی حاکم کے قول کے مطابق جو انہوں نے نقل کیا ہے اس بات میں تامل ہے۔

مروج الذہب جلد دوم ص ۱۰۹ مطبوعہ بیروت میں لکھا ہے کہ ''ابیطالب کے اسم (نام) ہونے میں نزاع ہے۔ایک گروہ کا کہنا ہے کہ ان کی کنیت ہی ان کا نام ہے اور ان کے لئے ''اسم علم'' نہیں ہے۔علیؑ نے پیغمبرؐ کے املاء کرانے پر خیبر کے یہودیوں کے لئے ایک خط میں لکھا کہ اس کو لکھا ''علی بن ابیطالب'' نے اور الف کو کلمۂ (ابن) حذف کر دیا۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ ابن، دو اسم علم کے بیچ میں واقع ہوا ہے نہ کہ ایک اسم علم اور ایک کنیت کے بیچ میں''

فتوح البلدان بلاذری کے ص ۷۲ پر لکھا ہے کہ یحییٰ ابن آدم نے کہا کہ: ایک خط میں نے اہل نجران کے ہاتھ میں دیکھا جس کا نسخہ اس نسخہ کے مشابہ تھا، خط کے آخر میں علی بن ابیطالب لکھا تھا مجھے نہیں معلوم کہ میں اس سلسلہ میں کیا فیصلہ کروں اس خط میں جس کو علیؑ نے قبیلۂ ربیعہ اور یمن کے لئے بعنوان صلح نامہ لکھا ہے اس کے آخر میں (اور وہی روایت معروف ہے) آپ نے لکھا کہ ـــ کَتَبَ عَلِیُّ بْنُ اَبِیْطَالِبٍ ـــ بنا بر نقل ابن میثم بحرانی شرح نہج البلاغہ جلد پنجم ص ۲۳۱

عمدۃ الطالب ص ۲۰، ۲۱ مطبوعہ نجف محمد بن ابراہیم نساب سے منقول ہے کہ ''انہوں نے علیؑ کے دستخط کو دیکھا ہے جس کے آخر میں لکھا تھا ــ علی بن ابوطالب ـــ''

اسی طرح انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ نجف میں ایک قرآن امیر المومنین علی علیہ السلام کی تحریر میں موجود تھا ۷۵۵ھ ہجری میں جب کتب خانہ جلا، اس زمانہ میں وہ بھی جل گیا اس قرآن کے آخر میں لکھا تھا ''علی بن ابوطالب''

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ خط کوفی میں واوٗ، یا کی شبیہ ہے اور صحیح علی بن ابیطالب ہے (اس بات کو ان کے دادا نے ان سے نقل کیا ہے) اس کے علاوہ بھی بہت سی باتیں ہیں جن کے چھان بین کی ہم میں طاقت نہیں ہے۔

جو کچھ کلمۂ ابو کے بارے میں بیان ہوا اس سے یہ پتہ چلا کہ کلمۂ ابو میں نہ کوئی حرج ہے اور نہ کوئی اشکال، خاص کر اس بات کے بعد تو اب عمدۃ الطالب کی تاویل کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی جو لغت قریش کے بارے میں کہی گئی ہے۔

دوسرے اعتراض کا جواب

ہم یہ کہتے ہیں کہ بلاذری کے کلام میں کوئی صراحت نہیں ہے اور اس کا کلام اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ یہ خط تبوک میں لکھا گیا ہو جیسا کہ خود وہ خط بھی اس موضوع پر دلالت نہیں کرتا جو کچھ خط میں موجود ہے وہ یہ ہے کہ اہل مقنا کی ایک جماعت پیغمبرؐ کے پاس مدینہ میں آئی تھی وہ لوگ واپس جانا چاہتے تھے شاید مدینہ تک ان کا سفر تجارت کی غرض سے تھا یا اس طرح کا کوئی خط لینے وہ پیغمبرؐ کے پاس آئے پیغمبرؐ نے بھی یہ خط ان کو لکھ دیا۔

بعض تاریخی کتابوں نے صرف اس بات پر اکتفا کیا ہے کہ پیغمبرؐ نے ۹ ہجری میں یہ خط اہل مقنا کو لکھا ہے۔(مکاتیب رسولؐ جلد ا ص ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰)

جو کچھ ہم نے یہاں نقل کیا وہ وہی ہے جو علامہ احمدی نے اس اشکال کے جواب میں لکھا ہے اس کے بعد نہ کوئی اشکال اور شبہ کی گنجائش ہے اور نہ روایت کی اصالت میں کوئی شک باقی بچتا ہے۔

۷۔ اہل دمشق کے ساتھ خالد بن ولید کا صلح نامہ تحریر کرنا۔ ابن سلام کہتے ہیں کہ محمد ابن کثیر نے ہمارے لئے اوزاعی سے اور انہوں نے سراقہ سے نقل کیا ہے کہ: خالد بن ولید نے اس صلح نامہ کو اہل دمشق کے لئے لکھا۔

''اِنِّیْ قَدْاَمَنْتُهُمْ عَلٰی دِمَائِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ وَ كَنَائِسِهِمْ... ہم نے ان کو، ان کے اموال کو اور ان کی عبادت گاہوں کو امان دی...... ابوعبیدہ کہتے ہیں کہ ''صلح نامہ لکھنے والے نے جو اس میں لکھا وہ مجھے یاد نہیں اور اس صلح نامہ کے آخر میں یہ لکھا ہے کہ ابوعبیدہؑ جراح جبیل بن حسنہ اور قضاعی بن عامر نے گواہی دی ہے یہ صلح نامہ ۱۳ھ ہجری میں لکھا گیا۔ (الاموال ص ۲۹۷) جس کو وہ لوگ تسلیم کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ تاریخ کو عمر نے وضع کیا ہے وہ بھی ۱۶ھ یا ۱۷ سنہ ہجری میں اور ان لوگوں میں سے کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ اس سے پہلے تاریخ وضع ہوئی ہے اور یہ بھی لائق توجہ ہے کہ دمشق عمر کی خلافت کے ابتدائی زمانہ میں فتح ہوا ہے بلکہ شام میں مسلمان سپاہیوں تک ابوبکر کی وفات کی خبر اور عمر کی خلافت کی خبر پہنچنے سے پہلے دمشق فتح ہوا ہے۔ برخلاف اس کے جو ہم نے دیکھا: فتح دمشق کی تاریخ میں غزوات اور جنگ کی کتاب لکھنے والوں نے اختلاف کیا ہے کہ یہ ۱۳سنہ ہجری کا واقعہ ہے یا ۱۴سنہ ہجری کا اور اس بات میں بھی اختلاف ہے کہ جس نے یہ مصالحت انجام دی وہ ابوعبیدہؑ جراح تھے یا خالد بن ولید۔ اسی طرح اس بات میں بھی اختلاف ہے کہ شام میں ان دونوں افراد میں سے مسلمانوں کا سپہ سالار کون تھا۔ ہمارے لئے یہ بات مسلم ہے کہ فتح دمشق ابوبکر کی وفات کی خبر پہنچنے سے پہلے ۱۳ھ میں ہوئی ہے۔ یا کم از کم اس خبر کے اظہار سے پہلے ابو عبیدہ کے ذریعہ ہوئی ہے اور اس صلح نامہ کو لکھنے والے خالد بن ولید تھے جو اس موقع پر فوج کے سپہ سالار تھے۔

ابوعبیدہ، ابن قتیبہ واقدی اور بلاذری کا خیال ہے کہ صلح نامہ لکھنے والے خالد بن ولید ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بات اس پر دلالت کر رہی ہو کہ صلح کے وقت لشکر کی سپہ سالاری خالد بن ولید کے ہاتھوں میں رہی ہو۔

واقدی کا کہنا ہے کہ: صلح کے سبب خالد اور ابوعبیدہ کے درمیان لفظی جھڑپ اور سخت کلامی ہوئی خالد کا اپنے موقف پر اصرار اور ان کے مقابل میں ابوعبیدہ کا ضعف،
اس سے خالد بن ولید کی سپہ سالاری کی تائید ہوتی ہے۔

بلاذری کہتے ہیں کہ ''ابوعبیدہ شہر دمشق کے مشرقی دروازہ کی طرف تھے اور زبردستی شہر میں داخل ہوئے۔ شہر کے لوگ خالد کے پاس آئے جو شہر کی دوسری طرف تھے خالد نے ان لوگوں کے ساتھ صلح کی اور ایک صلح نامہ مرتب کر لیا۔ ان لوگوں نے بھی شہر کا دروازہ ان کے لئے کھول دیا۔

اس کے بعد ابومخنف کی بات نقل کی ہے جو بالکل مذکورہ بالا قضیہ کے برعکس ہے اور پھر فرماتے ہیں یہ پہلی بات صحیح ہے۔ (فتوح البلدان ص ۱۲۹)

ہمارا بھی یہی خیال ہے اکثر مورخین کا قول وہ خط جو ہم نے شروع میں نقل کیا ہے اور دوسرے ادلہ یہ سب اس بات پر دلیل قطعی ہیں کہ خالد نے صلح نامہ کو اہل دمشق کے لئے تیار کیا اور اس کا قہری نتیجہ ہے کہ وہ سپہ سالار لشکر بھی تھے لشکر کی سپہ سالاری سے خالد کی معزولی کا حکم اس وقت پہنچا جب ان

لوگوں نے دمشق کا محاصرہ کیا تھا اور ابوعبیدہ نے اس بات کو اس لئے بیس دنوں تک چھپا رکھا تھا تا کہ خالد دمشق فتح کرنے میں سست نہ ہو جائیں۔ یہاں تک کہ جب دمشق فتح ہو گیا تو ابو عبیدہ نے ان کی معزولی کے فرمان کا اعلان کیا۔(البدایہ والنہایہ جلد ۷ ص ۲۳)

واقدی تحریر فرماتے ہیں کہ دمشق شب وفات ابوبکر میں فتح ہوا۔(فتوح الشام جلد ۱ ص ۵۸، ۵۹)

زینی وحلان مورخین میں سے ایک مورخ سے نقل کرتے ہیں کہ کہا جاتا ہے کہ خبر وفات ابوبکر دمشق فتح ہونے کے بعد ۱۳ھ میں اور وفات ابوبکر اس رات واقع ہوئی جس رات لشکر اسلام دمشق میں وارد ہوا اور یہ واقعہ ۲۲ جمادی الآخر کا ہے۔ وہ لوگ جو یہ بات کہتے ہیں وہ اس بات کے قائل ہیں کہ دمشق فتح ہونے کے بعد ۱۵ھ ہجری میں واقعۂ یرموک ہوا۔(الفتوحات الاسلامیہ جلد ۱ ص ۴۷)

ابن کثیر کہتے ہیں کہ سیف بن عمر کی ظاہر عبارت کی دلالت اس بات پر ہے کہ دمشق ۱۳ھ ہجری میں فتح ہوا لیکن مذکورہ عبارت کی دلالت اکثر ان مورخین کے نظریہ پر ہوتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ دمشق نیمۂ رجب ۱۴ھ ہجری میں فتح ہوا۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۷ ص ۲۲)

عبد الرحمن بن جبیر سے منقول ہے کہ: ابوعبیدہ خود مدینہ تشریف لے گئے تا کہ دمشق کی فتح کی خبر ابوبکر کو دیں لیکن جس وقت مدینہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ ابوبکر کا انتقال ہو چکا ہے اور عمر نے ان کو شام کی سپہ سالاری پر مامور فرمایا ہے جب ابوعبیدہ دمشق واپس پلٹے تو سپاہیوں نے مرحبا کہا اور کہا کہ مبارک ہو جس کو ہم نے بعنوان سفیر مدینہ بھیجا تھا اس کو ہمارا امیر بنا دیا گیا۔(البدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۲۴)

بہر حال جو خط ہم نے نقل کیا اور جو دلیلیں ہم نے پیش کیں ان سب کی دلالت اس بات پر ہو رہی ہے کہ خالد بن ولید سپہ سالار لشکر تھے اور انہوں نے اہل شام سے صلح کی اور تمام مورخین اس میں متفق ہیں حتیٰ اگر صلح نامہ ۱۵ھ میں لکھا گیا ہو تو یہ دوسرا خط ہوگا جو اس بات پر دال ہوگا کہ تاریخ خلافت عمر کے زمانہ میں وضع ہوئی ہے۔

لیکن مورخین اور راوی حقیقت سے کیوں منہ پھیرتے ہیں شاید باتوں اور منقولات کی آپس میں مشابہت اور واقعات کا ایک کے بعد ایک مسلسل واقع ہونا ان کو اشتباہ میں ڈالتا ہے......

شاید (اگر ہم حسن ظن رکھیں اور ان کو حسن ظن کے لائق سمجھیں) ان کا یہ اظہار نظر عمداً ہے اس لئے کہ اس طرح وہ بتا سکیں گے کہ عمر کا زمانہ بڑی بڑی فتوحات کا زمانہ تھا......اس طرح ان لوگوں نے بہت واضح کوشش کی ہے کہ خالد بن ولید کا تعارف ایک شجاع کی حیثیت سے کرائیں چاہے جھوٹ کا سہارا ہی کیوں نہ لینا پڑے۔

لیکن ہمیں یہ نہیں معلوم کہ حقیقت و واقعیت سے ان لوگوں کے دور ہونے کا اصلی سبب کیا ہے شاید زیرک قارئین اس بات کو سمجھتے ہوں۔

۸۔ سیوطی نے اس مجموعہ سے جو ابن قماح کی تحریر میں ہے نقل کیا ہے کہ ابن صلاح فرماتے ہیں کہ ابوطاہر محمد بن

جہمش زیادی نے تاریخ شروط میں ذکر کیا ہے کہ رسول خدا جب نصاریٰ نجران کو خط لکھ رہے تھے اس موقعہ پر آپ نے حضرت علیؑ کو حکم دیا کہ اس خط میں تاریخ ہجری ڈالو اور لکھو کہ 'یہ خط ۵ھ میں لکھا گیا ہے'۔۔۔ مذکورہ شخص اس بات کا اضافہ بھی کرتا ہے کہ سب سے پہلے اس کام کو رسولؐ خدا نے کیا نہ کہ عمر نے، عمر نے اسی عمل کی پیروی کی۔

(الشماریخ فی علم التاریخ سیوطی ص ۱۰)

سیوطی مزید فرماتے ہیں کہ: یہ روایت اتنی صریح ہے کہ کہا جاسکتا ہے کہ تاریخ لکھنے کی شروعات ۵ھ میں ہوئی ہے۔۔۔ پہلی روایت (روایت زہری) جس میں یہ ذکر ہے کہ پیغمبرؐ جس دن مدینہ میں وارد ہوئے اس دن سے تاریخ معین ہوئی ۔۔۔ اور اس روایت میں کوئی تضاد نہیں ہے۔۔۔ زہری کی روایت ظرف زمان ہے اور عبارت (یوم قدم) فعل سے متعلق نہیں ہے بلکہ مصدر (کلمۂ التاریخ) سے متعلق ہے۔ پیغمبرؐ نے حکم دیا کہ اس دن کو (مدینہ میں وارد ہونے والے دن) مبداء تاریخ قرار دیا جائے نہ یہ کہ اس دن تاریخ گذاری کریں۔ (الشماریخ ص ۱۰)

یہ سیوطی کی گفتگو ہے لیکن ملخص اور یقینی یہ ہے کہ رسولؐ خدا نے یہ حکم دیا کہ مبداء تاریخ ان کے مدینہ میں وارد ہونے کے دن کو قرار دیا جائے اور اول ربیع الاول کو روز اول شمار کیا جائے۔ اس طرح پیغمبرؐ نے تاریخ گذاری کی اور آپ نے اس تاریخ کو اس خط میں استعمال کیا جو نجران کو لکھا گیا تھا۔

بہر حال سخاوی کہتے ہیں کہ ''پس معلوم ہوا کہ عمر اس قضیہ میں تابع تھے متکبر نہ تھے۔'' (التراتیب الاداریہ جلد ۱ ص ۱۸۱)

سید عباس مکی فرماتے ہیں کہ تاریخ ایک گذشتہ روایت اور پسندیدہ روش تھی جب پیغمبرؐ خدا اہل نجران کو خط لکھوا رہے تھے اس وقت حضرت علیؑ نے آپ سے فرمایا کہ لکھدو ''یہ خط ۵ھ میں لکھا گیا'' اس کے بعد ابن شہاب کی روایت کو نقل فرماتے ہیں۔

۹۔ جو عبارت صحیفۂ سجادیہ میں ہے اس کا مندرجہ ذیل مفہوم نکلتا ہے کہ رسولؐ خدا نے مدینہ میں پہنچنے والے دن کو اللہ کے حکم سے مبداء تاریخ ہجری قرار دیا اور اسلامی تاریخ کو وضع کیا۔ (صحیفۂ سجادیہ ص ۱۰)

۱۰۔ انس بن مالک سے روایت ہے کہ انس نے کہا کہ اصحاب رسولؐ خدا نے ہمارے لئے بیان کیا کہ ہجرت کے سو سال نہیں گذریں گے مگر تم سب مرجاؤ گے۔

(مجمع الزوائد جلد ۱ ص ۱۹۷)

۱۱۔ ام سلمہ رسولؐ خدا سے نقل کرتی ہیں کہ ''**یقتل حسین علیہ السلام بن علی علیہ السلام علی راس ستین من مهاجری**'' رسولؐ خدا نے فرمایا کہ حسین ابن علی ۶۰ھ میں قتل کئے جائیں گے۔

۱۲۔ آخر میں ...... ڈاکٹر سعد ماہر محمد اپنی کتاب ''مشہد الامام علی فی النجف'' (ص ۱۰۴، ۱۰۵) پر اس خط کا ذکر فرماتے ہیں جو خالد بن ولید نے اہل حیرہ کے لئے لکھا ہے۔ خط کے آخر میں لکھا ہے کہ ''**وَاِنْ غَدَرُوْا بِفِعْلٍ اَوْ بِقَوْلٍ فَالذِّمَّةُ مِنْهُمْ بَرِيْئَةٌ وَ كَتَبَ فِيْ شَهْرِ رَبِيْعُ الْاَوَّلِ مِنْ سَنَةِ اثْنَتَىْ عَشْرَةَ**'' اگر انہوں نے گفتار و کردار کے ذریعہ مکر و حیلہ کیا اور عہد و پیمان کو توڑا تو ہماری قرارداد ان کے بارے میں ختم ہو

جائے گی۔ یہ سند ربیع الاول ۲ھ میں لکھی گئی۔

اور یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ حیرہ خالد بن ولید کے ہاتھوں ابوبکر کے زمانہ میں فتح ہوا۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ تاریخ جناب عمر سے پہلے وضع ہو چکی تھی۔

۱۳۔ حافظ عبدالرزاق ابوہریرہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ ''وَیْلٌ لِلْعَرَبِ مِنْ شَرٍّ قَدِاقْتَرَبَ عَلیٰ رَاسِ السِّتِّیْنَ، تَصِیْرُ الْاَمَانَۃُ غَنِیْمَۃً اِلَخْ'' وائے ہو عرب پر اس شر وفساد کی بنا پر جو ۶۰ھ میں پیش آئیں گے اور امانت کو مال غنیمت شمار کیا جانے لگے گا۔ الخ

(مصنف حافظ عبدالرزاق جلد ا ص ۳۷۳، ۳۷۵)

۱۴۔ حافظ عبدالرزاق نے ابن مسعود سے نقل کیا ہے کہ ''اِذَا کَانَتْ سَنَۃُ خَمْسٍ وَثَلاَثِیْنَ حَدَثَ اَمْرٌ عَظِیْمٌ فَاِنْ تَھْلِکُوْا فَبِالْحَرَاءِ وَ اِنْ تَنْجُوْا فَعَسَیٰ وَاِذَا کَانَتْ سَبْعِیْنَ رَأَیْتُمْ مَاتُنْکِرُوْنَ'' جب ۳۵ھ آئے گی تو ایک بڑا حادثہ پیش آئے گا اگر تم ہلاک ہو گئے تو سزاوار ہے اور اگر تم نجات پا گئے تو امید نجات ہے اور جب ۷۰ھ آئے گی تو اس وقت تم وہ چیز دیکھو گے کہ جس سے تم انکار کرو گے۔

۱۵۔ تطہیر الجنان ص ۶۷ مطبوعہ ۱۳۵۷ھ قمری نے اس حدیث میں جس میں مورد اطمینان راوی موجود ہیں، پیغمبرؐ خدا سے نقل کیا ہے کہ ''نَعَوْذُبِاللّٰہِ مِنْ رَأسِ السِّتِّیْنَ وَفِیْ سَنَۃِ سِتِّیْنَ وَمِنْ اِمَارَۃِ الصِّبْیَانِ'' خدا کی پناہ ۶۰ھ سے اور دوسری روایت میں ہے کہ ۶۰ھ میں خدا کی پناہ بچوں کی حکومت سے۔

۱۶۔ عَنْ مَالِکٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ مَرْفُوْعاً اِذَاکَانَ رَأسُ السَّبْعِیْنَ وَمِأۃُ فَالرِّبَاطُ بِجَدِّہٖ اَفْضَلُ مَایَکُوْنُ مِنَ الرِّبَاطِ۔ (لسان المیزان جلد ۲ ص ۷۹)

مالک نے نافع سے اور انہوں نے عبداللہ بن عمر سے اور انہوں نے پیغمبرؐ سے نقل کیا ہے کہ ۱۷۰ھ میں بہترین مرزبانی جدہ کی مرزبانی ہوگی۔ ۱۴، ۱۵، ۱۳، اور ۱۶ نمبر میں ہم نے جو کچھ نقل کیا وہ پیغمبر کا فرمان جو غیب کی باتوں پر مشتمل ہے اور یہ غیب کی خبر پیغمبرؐ نے لوگوں کو دی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ خود پیغمبرؐ ہی تاریخ ہجری کے وضع کرنے والے ہیں۔

بازگشت

گذشتہ بیان سے یہ بات روشن ہوگئی کہ لوگون کے درمیان جو یہ مشہور ہے کہ تاریخ کے وضع کرنے والے جناب عمر تھے تو یہ بات قابل قبول نہیں ہے بلکہ جو کام عمر نے انجام دیا وہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے محرم کو اول سال قرار دیا درا ں حالیکہ پیغمبرؐ کے زمانہ میں ربیع الاول ہی اول سال قمری ہجری تھا۔ یہ عمل یا تو خود ان کی فکر کا نتیجہ تھا یا جناب عثمان کی پیش کش پر انہوں نے یہ کام انجام دیا (جیسا کہ ہم کو معلوم ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں محرم، اول سال تھا)

شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ ہجری جس کو پیغمبرؐ اکرم نے وضع فرمایا تھا، چونکہ لوگوں کو اس کی بہت کم ضرورت پڑتی تھی اس لئے وہ لوگوں کے درمیان (پیغمبرؐ کے زمانہ میں)

مشہور نہ ہو سکی۔ جب معاشرہ میں تاریخ کی ضرورت کا احساس ہوا تو اس وقت عمر نے صحابہ کو جمع کیا

تا کہ وہ کسی تاریخ کا انتخاب کریں جیسا کہ پورا واقعہ گذر چکا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جو اجتماع عمر نے تشکیل دیا تھا اس میں غرض مندانہ پیش کش ہوئی تا کہ اس طرح پیغمبرؐ نے جو تاریخ وضع فرمائی ہے اس کو فراموش کر دیا جائے لہٰذا ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ رومی تاریخ کی پیش کش ہو رہی ہے تو کوئی تاریخ اسکندر پیش کر رہا ہے۔ عمر ہرمزان کو مشورہ کے لئے بلاتے ہیں (دراں حالیکہ عمر ایرانیوں سے شدید نفرت کرتے تھے) اور وہ اس ایرانی تاریخ کو پیش کرتا ہے جو ان کے بادشاہ کی شہنشاہیت کے آغاز سے شروع ہوتی تھی۔ ایک تیسرا گروہ پیغمبرؐ کی ولادت والے (عام الفیل) اس سن کو پیش کرتا ہے جس کو اعراب جاہلیت تسلیم کرتے تھے۔ تاریخ اعاجم وغیرہ میں اس سے متعلق بہت سی باتیں درج ہیں۔

(التنبیہ والاشراف ص ۲۵۲)

لیکن علیؑ جو محافظ دین اور علمبردار حق ہیں...... وہ مناسب وقت پر اعلان کرتے ہیں کہ اسی تاریخ ہجری سے استفادہ کیا جائے جس کو حضورؐ نے وضع کیا ہے اور جس کو حضرتؐ نے اپنی زندگی میں بہ نفس نفیس متعدد بار عہد ناموں اور خطوں میں لکھوایا ہے۔

اور یہ ممکن نہیں ہے کہ ان کی پیش کش رد ہو جائے اس لئے کہ یہ حق ہے اور حق ہر چیز سے بالاتر ہے اس سے بالاتر اور کوئی چیز نہیں۔

عیسوی تاریخ کیوں؟

ضروری ہے کہ ایک نظر ہم عیسوی تاریخ پر بھی ڈالیں، ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ یہ دیکھنے کو ملے گا کہ اہل مغرب اور غیر مسلم اپنے قدیم آثار اور گذشتہ آداب و رسوم کی چاہے وہ کتنے ہی ناچیز کیوں نہ ہوں، حفاظت کرتے ہیں اور کسی بھی زمانہ یا کسی بھی جگہ اس سے دست بردار نہیں ہوتے۔ جہاں اسلامی تاریخ لکھی جاتی ہے وہاں اصرار کرتے ہیں کہ ہجری تاریخ کے بدلے عیسوی تاریخ لکھی جائے۔ چاہے یہ بہت سے حقائق کے درہم برہم ہو جانے یا مٹ جانے کا باعث کیوں نہ ہو اور دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہم ان مغربی فریب دہندہ نعروں کی وجہ سے بہت سی بنیادی چیزوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

ہم تاریخ ہجری قمری سے جو باعث عزت ہے اور جس سے ہماری تاریخ وثقافت استوار ہوتی ہے، تاریخ عیسوی شمسی کی طرف اپنا رخ موڑ لیتے ہیں جو چوتھی صدی ہجری میں بنی ہے جو حکومتیں اپنے آپ کو اسلامی حکومت سمجھتی ہیں اور جو قومیں اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہیں وہ تاریخ عیسوی سے استفادہ کرتی ہیں جو نہ رومی ہے اور نہ ایرانی جس کی پیش کش صدر اسلام میں ہوئی تھی۔

ہاں ان لوگوں نے روشن فکری اور تمدن کے نعروں کے نام پر تاریخ عیسوی کو قبول کیا اور جو ان کی عزت کا سرمایہ تھا اس سے روگردانی کی ہے۔

مخلصانہ دعوت

ہم ملت مسلمہ سے اس بات کے خواہش مند ہیں کہ وہ اسلامی تاریخ کو اپنی جنتریوں اور تاریخوں میں

استعمال کریں اس لئے کہ یہ ان کے ماضی کو حال سے مربوط کرتی ہے اور ان کی عزت وسربلندی کے راز کو جو ماضی میں ان کا دین تھا، دہراتی ہے۔ ان کو یہ بتلاتی ہے کہ پیغمبرؐ اسلام کی زندگی کو نمونہ بنانا چاہیے اور جب بھی وہ اپنی اقامت گاہ میں اپنے فرائض الٰہی پر عمل نہ کرسکیں تو ہجرت کو سکونت پر ترجیح دیں اور زمین کے دوسرے حصوں پر جا کر اپنے الٰہی فرائض کو انجام دیں۔

تاریخ ہجری مسلمانوں کو تحریک اور امید عطا کرتی ہے ان کو سکون اور بے التفاتی سے کھینچ کر باہر نکالتی اور لامحدودیت کی سمت رواں دواں بناتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر ہم یہ کہیں کہ کوئی بڑا واقعہ ہی مبداء تاریخ ہونا چاہئے تو پھر ظہور پیغمبرؐ اور ان کے بعد رونما ہونے والے واقعہ سے بڑا اور کون سا واقعہ ہوسکتا ہے۔

❁❁❁

بقیہ امام حسن عسکری علیہ السلام

علماء نے لکھا ہے کہ یہ کتاب ایک سوبیس اجزاء پر مشتمل تھی۔

افسوس ہے کہ یہ علمی ذخیرہ اس وقت ہاتھوں میں موجود نہیں ہے مختلف کتابوں میں تفسیر قرآن کے متعلق حضرت کے بعض ارشادات ملتے ہیں ممکن ہے وہ اسی سے ماخوذ ہوں لیکن ایک کتاب جو ''تفسیر امام حسن عسکریؑ'' کے نام سے شایع شدہ موجود ہے مگر وہ مذکورہ بالا ذخیرۂ علمی سے الگ ہے اس کا پتہ صرف چوتھی صدی ہجری سے چلتا ہے اور شیخ صدوق محمد بن علی بابویہ قمیؒ نے اس کو معتبر سمجھا ہے مگر ان کے پیش روافراد جن سے موصوف نے اس تفسیر کو نقل کیا ہے بالکل مجہول الحال ہیں۔ بہرحال اس تفسیر کے متعلق علمائے رجال مطمئن نہیں ہیں جہاں تک غور کیا جاتا ہے اس کی نسبت امام حسن عسکریؑ کی طرف صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ ہاں بے شک آپ کا ایک طویل مکتوب اسحٰق بن اسمٰعیل اشعری کے نام اور کافی ذخیرۂ مختصر حکیمانہ مقولات اور مواعظ وتعلیمات کا کتاب تحف العقول میں محفوظ ہے جو اس وقت بھی اہل نظر کے لیے سرمۂ چشم بصیرت ہے۔

یہ علمی کارنامے اس حالت میں ہیں جب کہ مجموعی عمر آپ کی ۲۸/برس سے زیادہ نہ ہوسکی اور اپنے والد بزرگوار کے بعد صرف چھ برس امامت کے منصب پر فائز رہے اور وہ بھی ان مشکلات کے شکنجہ میں جن کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔

وفات:۔ اتنے علمی ودینی مشاغل میں مصروف انسان کو کہیں سلطنت وقت کے ساتھ مزاحمت کا کوئی خیال پیدا ہوسکتا ہے مگر ان کا بڑھتا ہوا روحانی اقتدار اور علمی مرجعیت ہی تو ہمیشہ ان حضرات کو سلاطین کے لیے ناقابل برداشت ثابت کرتی رہی وہی اب بھی ہوا اور معتمد عباسی کے بھجوائے ہوئے زہر سے ۸/ربیع الاول ۲۶۰ھ میں آپ نے وفات پائی اور اپنے والد بزرگوار کی قبر کے پاس سامرے میں دفن ہوئے جہاں حضرت کا روضہ باوجود ناموافق ماحول کے مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔

❁❁❁

جوانوں پر مغرب کی طرف رجحان کا اثر

عماد العلماء علامہ ڈاکٹر سید علی محمد نقوی دام ظلہ

دنیائے اسلام میں آخری صدی کا ایک اہم ترین انقلاب نوجوانوں کا ایک اہم اور ممتاز طبقے کی شکل میں ظہور ہے۔ مغرب کی طرف رجحان کا سلسلہ شروع ہونے، صنعت کے منظر عام پر آنے تعلیم کے نئے نظام کی آمد اور خاندانی روابط میں ایک انقلاب برپا ہونے کے بعد نوجوانوں نے ایک طبقے کی شکل میں سر اٹھایا، اس سے پہلے سماجیات کے نقطۂ نظر سے نئی پود کو ایک سماجی طبقے کی حیثیت حاصل نہیں تھی بلکہ ایک سنّی گروہ اور جماعت کے طور پر متعارف تھی۔

سماجی لحاظ سے وہ کچھ ان امتیازی خصوصیات کے حامل نہ تھے کہ ایک مستقل طبقے کی تشکیل کرتے۔ آخری صدی میں نئی پود، اس کی مشکلات اور ضرورتیں پہلی دفعہ ایک مستقل اور ممتاز سماجی مسئلہ اور عقیدہ لاینحل کی شکل میں سامنے آئیں جن کا اس کے مستقل طبقے کی شکل میں ظہور سے لازم وملزوم کا رشتہ تھا۔

مخصوص مسائل و مشکلات سامنے آئیں اور پھر ایسے طبقے، فرقے، یونین اور انجمنیں بنیں جن کا تعلق خاص طور سے صرف جوانوں سے تھا، بڑوں کا ان میں کوئی حصہ نہ تھا۔

اس طبقے کے کچھ اپنے مخصوص مسائل، مشکلات کام، تعلیم، تفریح اور دوسری سرگرمیاں ہیں جو نئی پود کی خصوصیتیں ہیں۔ اگلے زمانے میں تعلیم جیسی چیز کا تعلق تک صرف جوانوں کے ساتھ مخصوص نہ تھا، چنانچہ قدیم تعلیمی درسگاہوں میں مہد سے لیکر لحد تک تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کی روایت ہنوز موجود ہے۔ اس نظام تعلیم میں استادی کے درجے پر پہنچنے کے بعد بھی آدمی طالب علم ہی شمار ہوتا ہے ایک جماعت کو تعلیم دیتا اور دوسری جماعت سے تعلیم حاصل کرتا ہے لیکن نئے نظام تعلیم نے سن کے لحاظ سے تعلیم کو صرف جوانوں کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے، یہ اور اسی قسم کے دوسرے عوامل ہیں جنھوں نے جوان نسل کو ایک ممتاز سماجی طبقے کی شکل میں ڈھال دیا۔

اس اہم سماجی انقلاب کے بعد یورپ اور مشرق کے سامراجی طاقتوں کی یہ کوشش ہوئی کہ اس نئی پود اور طبقے میں مغربی انقلاب وتہذیب کے نمونوں کی ترویج واشاعت کریں۔ ۱۶ سے ۲۵ سال تک کی عمریں عموماً جذبات و خیالات میں ہیجان اور اتھل پتھل کا دور ہے، ان عمروں میں انسان کے اندر غیر معمولی شور و ہنگامہ اور ذوق وشوق پیدا ہوتا ہے۔ اور مختلف لحاظ سے وہ ایک بحرانی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ ان سالوں کو بحرانی دور سے زیادہ تر اسی لئے تعبیر کرتے ہیں کہ ان میں نئی نسل کے اندر مہم جوئی اور حصول آزادی کا شدید رجحان پیدا ہوتا ہے وہ سوسائٹی میں اپنا مخصوص رول ادا کرنا چاہتی ہے۔ ان فطری رجحانات ومیلانات کا بہاؤ اگر صحیح

راستے کی طرف کر دیا جائے تو وہی لوگ سماج کے لئے سعادت وخوش نصیبی کا سرچشمہ ثابت ہو سکتے ہیں لیکن مشرق و مغرب کے جن کارگذاروں نے نفسیات اور سماجیات کو اپنے سامراجی منافع اور مصالح کے لئے استعمال کیا انہوں نے اس نفسیاتی مسئلہ کا غلط فائدہ اٹھایا انہوں نے اس بات کی کوشش شروع کر دی کہ درج بالا رجحانات کو سماج کے ارزشی (اقداری) تہہ و بالا کرنے سامراجی تہذیب و ثقافت کی تاخت و تاراج کے لئے زمین ہموار کرنے اور مشرق کی تہذیبی اور تاریخی ہیئت کو مجروح اور پامال کرنے کے کام میں استعمال کریں۔

نوجوانوں میں مغرب کی طرف رجحان کی اشاعت کے گوناگوں اسباب وعوامل ہیں مغرب کی طرف رجحان کے پھیلنے کا ایک اہم نفسیاتی عامل نئی پود کی فطری ''نوگرائی'' تھی۔ نئی نسل کے افراد بلا ملاح کی کشتی کی طرح بہت جلد بپھری ہوئی لہروں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں، فلسفیانہ اور اعتقادی لحاظ سے چونکہ وہ ہنوز عمق و گہرائی اور پختگی سے بے بہرہ ہوتے ہیں دوسری طرف عہد جوانی کی مخصوص ہیجانی کیفیت انہیں مہم جوئی پر مجبور کرتی ہے انجان افق تک رسائی کے لئے انہیں غیر معمولی اشتیاق اور دلچسپی پیدا کر دیتی ہے اس وجہ سے نفسیاتی لحاظ سے دیگر طبقے کی بہ نسبت بہت جلد وہ ہر نئے فیشن اور نمونہ کی طرف جذب ہو جاتے ہیں نئے فیشن کی طرف ان کے فطری میلان نے بہت جلد نوجوانوں کی ایک انبوہ کو مشرق یا مغرب کے دام بلا میں گرفتار کر دیا۔

اس تباہ کن سیلاب کے مقابلے میں بیشتر اسلامی ملکوں میں بڑے بوڑھوں نے اصلی اسلام کو ایک مکمل انقلابی نظریہ کے طور پر پیش کرنے میں کوتاہی کی۔ مذہب کا ایک عام اندازہ جس کا دور انحطاط و زوال میں رواج ہو گیا تھا اور جس کا خلاصہ اور ماحصل اسلام کو چند خرافاتی رسوم وعقائد میں محدود کر دینا تھا بہت سے مواقع میں اسلام کے اصلی تعلیمات سے بہت دور ہو گیا تھا اور اس نئی پود کو مطمئن نہیں کر سکتا تھا۔ بیشتر اسلامی ملکوں میں (جن میں ترکی، ہندوستان اور مشرق بعید کے ممالک بھی شامل ہیں) نوجوانوں کی فکری پرداخت کے لئے کافی خوراک مہیا نہیں ہوئی اس خلاء کا مشرق ومغرب کی بدیسی طاقتوں نے ناجائز فائدہ اٹھا کر بھرپور وار کیا۔

متعلق روشن خیال طبقہ، سنیما کی فلموں کے بنانے والے اور ریڈیو وٹیلیویژن کے پروگرام ڈائرکٹر سب نے مل کر یہ طے کیا کہ نوجوانوں کو اپنے دام فریب میں گرفتار کریں تمام فکری اور ثقافتی اڈے اور تمام اقتصادی سیاسی اور حربی اقتدار کی باگ مغرب کی طرف مائل عناصر کے ہاتھ میں تھی، دائیں بائیں بازو کی نظریات سے متعلق جو کتابیں بھی انھوں نے چاہیں جوانوں کے ہاتھ لگا دیں لیکن بیشتر اسلامی ملکوں میں اسلامی تہذیب وثقافت سے متعلق کتابوں کا گویا قحط ہی تھا۔ ایک طرف مفید اور رہنما کتابوں کی کمی اور دوسری طرف ہمہ جہتی پروپیگنڈہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ جوانوں کی بڑی تعداد بدیسیوں کے مکتب فکر اور نمونہ ثقافت کی طرف مائل ہو گئی لیکن جن ملکوں میں تیز قدم علماء اور پختہ عزم روشن خیال لوگوں نے اپنی ذمہ داری سمجھی اور اسلام کو ایک اصلی متحرک اور جامع

نظام کی شکل میں پیش کیا اور نوجوانوں کی فکری پرورش پر دھیان دیا۔ وہاں نئی پود نہ صرف یہ کہ اپنے سے بیگانہ نہ ہوئی اور دوسروں کی طرف مائل نہ ہوئی بلکہ یورپ کی ثقافتی اور سیاسی بساط کو الٹ دینے میں اس نے اہم رول بھی ادا کیا نیز اِسلَامِیْ نَشْأَۃِ ثَانِیَہ اور رجوع بذات کی تحریک میں اس کا مخصوص حصہ ہو گیا۔ صحیح کتب کی رہنمائی کا کام جب بہتر طریقے پر انجام پاتا ہے اور نئی پود کی نفسیاتی فیلڈ کو صحیح رخ دینے کی کوشش کی جاتی ہے تو پھر یہی نسل ثقافتی سامراج کے انحرافی دباؤ کے مقابلے پر بجائے اس کی طرف مائل ہونے کے اس سے سرکشی کرتی ہے۔

فرنگی مآب روشن خیال طبقے نے نئی پود کو خراب کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے کیونکہ تعلیم یافتہ جوانوں نے جب فکری خلاء کا احساس کیا تو ان لوگوں کا سہارا لیا جو انھیں فکری غذا فراہم کر سکیں۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جن لوگوں نے حواس کی فکری تغذیہ کی ذمہ داری سنبھالی وہ خود حواس باختہ اور بدیسیوں سے وابستہ تھے ان کی ساری توجہ انھوں ہنر برائے ہنر اور (منفی باف منھیلسٹ ادیبوں) کی تصانیف کے ترجمے جیسے بکت وکامو، یونسکوئی تحریروں کی طرف موڑ دی، اور نشہ آور دوائیں اس نسل کے خون میں پیوست کر دیں ان کی تمام تر کوششیں اس امر پر مرکوز ہو گئیں کہ تیسری دنیا کی نئی پود اپنی اصلی انسانی قدروں کو فراموش کر دے اور اس کی جگہ زندگی کی مادی اور مصرفی قدروں کو اختیار کر لے۔ قابل ذکر بات ہے کہ نئے نظام تعلیم اور مذکورہ بالا طبقہ سے وابستہ اساتذہ اور ادباء کا بھی اس کوشش میں کچھ نہ کچھ حصہ رہا ہے۔

منسوب کی طرف رجحان اور بازارو و سوقیانہ تہذیب وثقافت کی ترویج واشاعت کے بہترین ذرائع سنیما، ٹیلیویژن، جاسوسی اور عشقی ناول اور کہانیاں اور سماج میں مرد عورتوں کا آزادانہ اختلاط وغیرہ تھے۔

مغرب کی طرف رجحان نے اضافہ فساد کے ایک خودکار نظام کو جنم دیا۔ جس کی شکل یہ تھی کہ عورتوں کے درمیان پھیلی فساد و بدنظمی اور آزادی وخودمختاری نے ان جوان لڑکوں کو جو جنسی بحران کے بھنور میں پھنسے زندگی گزار رہے تھے، فاسد اور بدچلن کر دیا اور ان جوان لڑکوں کی بدچلنی نے لڑکیوں خصوصاً مہاجر دیہاتی عورتوں کی آوارگی اور ہرزہ گردی کے بھنور میں لا کر ڈال دیا۔

فساد کے اس خودکار نظام کی سب سے بڑی غذا دیہاتی لڑکے لڑکیاں تھیں جو شہروں کی طرف ہجرت کے رجحان کے نتیجے میں بڑے بڑے شہروں میں نو وارد ہوئے فساد کے لاتعداد ڈھکانوں اور شہوت رانی کے بے انتہا مراکز سے روشناس ہوتے اور چونکہ اپنے خاندان اور آشناؤں سے بھی دور ہوتے تھے اس لئے بے خوف وخطر اور کسی ذمہ داری کا احساس کئے بغیر لا ابلالی پن کے مظاہرے کرتے۔

دوسری جانب نہ صرف یہ کہ کوئی صحیح تربیتی ادارہ موجود نہ تھا بلکہ مغرب سے وابستہ حکومتوں کے امکانات بھی فساد و بدنظمی اور فحش و بے حیائی کے مروخوبی کے ہاتھ میں تھے ان اسباب کا نتیجہ یہ ہوا کہ جوانوں میں اخلاقی بگاڑ ہوا اور

وہ حقیقی زندگی کے قدروں سے دور جا پڑے لیکن انھیں نو وارد دیہاتی جوانوں میں کچھ ایسے بھی تھے جن کو پہلے سے صحیح تربیت ملی ہوئی تھی اور مضبوط ثقافتی شخصیت اور شعور سے وہ بہرہ مند تھے انھوں نے بدلی ثقافتی عناصر کو اپنے افکار و خیالات اور اپنے نظام زندگی سے ہم آہنگ نہیں پایا اور مغربی نظام اقدار میں جذب ہونے کے بجائے انھوں نے اس کے خلاف ردعمل کا اظہار کیا۔ دیہاتی جوانوں کے اس طبقے کی شہر میں آمد نے ''رجوع بذات'' (اپنی طرف واپسی) کی تحریک کو اور تیز کر دیا۔

بعض جوانوں کے اسلام سے دور ہونے اور بدیسیوں کی آغوش میں پہنچنے کا ایک دوسرا عامل بڑے بوڑھوں کا نا مناسب برتاؤ تھا۔ اسلامی ملکوں کے دور انحطاط و پستی اور عہد انجماد میں جبکہ مسلمانوں کا معاشرہ بہت سے مواقع میں اصلی اسلامی تعلیمات کو فراموش کر چکا تھا جوانوں اور بچوں کے ساتھ اپنے روابط میں بڑے بوڑھوں نے اسلامی ہدایات کو پیش نظر نہیں رکھا، اس کے بجائے ان کے ساتھ وہ تیزی، گرم مزاجی اور روکھے پن سے پیش آئے۔

غصہ ور والدین کی اس روش نے بہت سی خرابیاں پیدا کر دیں، نئی نسل کو روایتی اقدار سے بے تعلق کرنے اور فرنگی مآبی کے دام فریب میں گرفتار کرنے میں ان کا پورا اثر ہے۔ ان روایتی والدین کی نیت اگر چہ بہتر تھی اور جہالت و لاعلمی سے ہی وہ اس طرح کی غلطی کر بیٹھے لیکن اسلامی معاشرے کو ان کی اس غلطی کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ اس اثناء میں ہم ان لا تعداد جوانوں کو جو اسلامی معاشرے کی بجا طور پر عظیم انسانی ثروت اور دولت تھے، دنیائے اسلام کے مختلف حصوں میں ہاتھ سے دے بیٹھے۔

آخر میں ایک ایسا عامل جس نے بہت سے جوانوں کو مغربی تہذیب و ثقافت کے نمونوں خصوصاً مارکسیزم کی طرف مائل کر دیا سماجی نا انصافیاں اور مالی واقتصادی پریشانیاں تھیں مشرقی معاشرے کی انحطاط و پستی اور اسلامی تعلیمات سے دوری کے عہد میں خصوصاً یورپ سے وابستہ خود غرض، منحوس اور شیطانی حکومتوں جیسے پہلوی عہد حکومت کے زیر سایہ نئی سماج کی نئی پود یا تو خود ہی ناداری، ناانصافی اور پریشانی دام میں گرفتار تھے یا دوسرے بچوں کو بڑے بڑے شہروں کی گلی کوچوں اور بازاروں میں یا شہروں کے اطراف کھنڈروں میں آوارہ، ننگے اور بھوکے گھومتے ہوئے دیکھتی تھی۔ ایسی حالت میں مشرق و مغرب کے سامراجی کارکنوں نے صنعتی سرمایہ داری یا کمیونسٹ معاشرے کے لوگوں کے طرز زندگی کے جھوٹے اور دلفریب نمونے ان کی نگاہوں کے سامنے پیش کئے۔ اس طرح کے نوجوان جن میں ابھی فکری پختگی کی کمی تھی اور مغربی نظام (جن میں مارکسیزم بھی شامل ہے) سے پیدا ہونے والی آفتوں کا بھی انھیں علم نہیں تھا، ان پر پیگنڈوں کے دام فریبی میں پھنس جاتے، مغرب کی طرف یہ رجحان چاہے امریکہ سے ماخوذ ہو یا روس سے، کوئی فرق دونوں میں نہیں ہے کیونکہ درحقیقت دونوں قسموں کو۔ ایک براہ راست دوسرا بالواسطہ۔ یورپ ہی کی پیداوار سمجھا جا سکتا ہے۔

ان اسباب کی بنا پر اور مشرقی و مغربی بلاک کے

سامراجی کارکنوں کے پھیلائے ہوئے جال کی موجودگی میں نوجوانوں کا طبقہ اسلامی معاشرے میں دوہری آفت سے دوچار ہوا، یا تو شوقیانہ پن اور عدم تشخص کے دام میں پھنس گئے اور آسودگی وخوشحالی اور مصرف کا رویہ اختیار کر لیا یا بدیسی نظریات کے دام میں گرفتار ہیں اور اقتصادی لحاظ سے وہ صحیح راستے سے منحرف ہو گئے۔

مغربی ثقافت کے نمونوں کی اشاعت کے نتیجے میں ان نوجوانوں کا ایک طبقہ تہی مغز و خالی الذہن اور سوقیانہ موجودات کی شکل اختیار کر گیا اور مصرف کے دام میں گرفتار ہوا۔ ٹھیک اس کھلونے کی طرح جسے حسب خواہش لباس پوشاک پہناتے اور بناتے سنوارتے ہیں۔

یہ طبقہ مغرب کے سیاسی اور ثقافتی سامراج اور اس کی لادی ہوئی قدروں کا لقمہ بن گیا۔

مغرب کی طرف مائل جوانوں کا دوسرا طبقہ ان لوگوں کا تھا جو اگر چہ شوقیانہ پن میں گرفتار نہیں ہوئے مگر راہ راست سے برگشتہ ہو کر روس، چین، آبنائی حتیٰ کہ امریکہ کے بظاہر انقلابی اور دلفریب نظریات کے دام بلا میں جا کر پھنس گیا۔ دونوں طبقوں نے اپنی تہذیب وثقافت کو خیر کہا، اپنی تاریخی ثقافتی اور مکتبی ہیئت وشخصیت کو ہاتھ سے دے بیٹھے اور اس راستے پر اپنی جانیں تک نچھاور کر دیں۔

پہلا طبقہ مغربی سرمایہ داری اور مصرف پرستی کا کھلونا بن کر رہ گیا جبکہ دوسرا طبقہ مارکسیزم، سوشلزم اور دوسرے بدیسی نظریات پر قربان ہو کر رہ گیا۔

اپنی تاریخ و تعاقب سے بے تعلقی نے ان نوجوانوں میں سخت قلبی وذہنی تناؤ پیدا کر دیا، ان میں شورش، سرکشی و بغاوت، خطرناک حد تک منشیات کا استعمال، اخلاقی گراوٹ جنسی مشکلات اور ہزاروں دوسرے مسائل کھڑے کر دئے۔

مغرب کی طرف میلان کے سبب نئی نسل زیادہ سے زیادہ حیرانی وسراسیمگی کی شکار ہوگئی ان میں خاص طور سے جن نوجوانوں نے اپنی سماجی کردار ثقافتی اڈوں کو ترک کر دیا اور بدیسیوں سے جا ملے انھیں اپنی شخصیت اور ہویت کے گم ہو جانے اور شوقیانہ پن کا شکار ہونے کی تکلیف کا احساس ہونے لگا۔ جو نوجوان مغرب کی طرف میلان کے دام کے شکار نہیں ہوئے تھے اور اپنی تاریخ، تہذیب اور نظریات سے وفاداری کے ساتھ چپکے رہے، اسے معاشرے میں جہاں فرنگی مآبی کی لہروں نے ستم ڈھانے شروع کر دئے تھے وہ سخت اذیت اور تکلیف محسوس کرنے لگے جن نوجوانوں نے بے طرفی سے کام لیا اور کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا، تعلیم ختم کر کے جب عملی زندگی میں انھوں نے قدم رکھا تو انھیں بھی اس تلخ حقیقت کا اندازہ ہوا کہ مغرب کی طرف میلان والے نظام میں جو چیز ترقی اور پیش رفت کا ذریعہ تھی وہ صرف پیشہ اور روابط میں ہے، علم وفرائض اور استعداد ولیاقت نہیں ہے۔ اس طرح مغرب کی طرف میلان نے بیشتر اسلامی ملکوں میں نوجوانوں کو صرف حیرانی اور مایوسی کا تحفہ دیا ہے۔

بقیہ صفحہ ۴۳ پر

ہشام بن الحکم
جلیل القدر صحابی امام جعفر صادقؑ

مولانا سید علی حیدر صاحب طاب ثراہ

نام ونسب اور ابتدائی حالات:۔ آپ کا نام ہشام اور کنیت ابو محمد ہے ۔ باپ کا نام حکم تھا جن کے حالات نہیں ملتے ۔ ہشام کا سنہ ولادت بھی پیش نظر کتابوں میں مذکور نہیں ہے اور ایسا ہونا بعید بھی نہیں کیونکہ ولادت کے وقت کسے معلوم تھا کہ یہ لڑکا علمی دنیا میں روشن ستارہ بن کر چمکے گا تاکہ تاریخ ولادت وغیرہ ضبط کی جاتی ۔

شہر کوفہ میں ایک قبیلہ کندہ تھا جس کی طرف منسوب ہونے سے آپ کندی کہے جاتے ہیں اور اسی شہر کے محلہ بنی شیبان میں آپ کا مکان تھا اور یہی شہر مسقط الراس بھی ہے ۔ لیکن پیدا ہونے کے کچھ دنوں بعد کوفہ سے قریب عراق کے ایک دوسرے شہر واسط میں آنا ہوا اور یہیں بچپن کا زمانہ بسر کیا جہاں مستقل سکونت اختیار کر لی سن رشد پر پہونچنے کے بعد اس زمانہ کا شریف ترین پیشہ اختیار کیا اور بغداد کے محلہ کرخ میں آپ کی تجارت ہونے لگی بعد از اں تجارت نے اتنی ترقی کی کہ بغداد میں چلے آئے اور قصر وصناح کے حوالی میں رہنے لگے ۔

ابتدائی مذہب:۔ دوسری صدی ہجری کے وسط میں چونکہ سلاطین بنی عباسیہ کے علمی ذوق سے مختلف زبانوں سے حکمت وفلسفہ و مذاہب مخالفین کی کتابیں عربی زبان میں ترجمہ کی گئیں لہٰذا مذہب اسلام اس سادگی پر باقی نہ رہا مسلمانوں میں مذہبی آزادی کے ساتھ فلسفیانہ خیالات کی اشاعت ہونے لگی جس کے سبب سے اسلامی مسائل و معتقدات پر رد وقدح کا دروازہ کھل گیا اور مناظرہ ومباحثہ کا بازار گرم ہو گیا نتیجہ یہ ہوا کہ جس طرح کسی بادشاہ کے ضعیف اور مغلوب ہو جانے سے اس کے ملک میں طوائف الملوکی پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح اسلام میں بھی نت نئے اعتقادات اور جدید مذاہب کا ظہور ہونے لگا اور جس شخص نے چاہا ایک فرقہ علٰحدہ کر کے اس کا اپنا ایک نام دے دیا ۔

مذہب کے اسی پر آشوب زمانے میں ہشام بن الحکم کوفہ میں پیدا ہوئے جو پہلے مذہب جہمی رکھتے تھے مگر چونکہ ذہن وذکا میں فرد تھے اس مذہب کی خرابی محسوس کر رہے تھے یا اس پر ایسا اعتماد تھا کہ ہمچو من دیگرے نیست کا خیال تھا جس سے چاہا کہ امام وقت کو مغلوب ومحجوج کریں غرض کسی وجہ سے ہو یہ خدمت جناب امام جعفر صادقؑ میں حاضر ہوئے ان کی تیزی اور ذکاوت ایسی تھی کہ عمر بن یزید جو ہشام کا بھتیجہ تھا بیان کرتا ہے کہ ''ہشام نے مجھ سے کہا کہ مجھے امام ابوعبداللہ جعفر صادقؑ کے پاس لے چلو تاکہ ان سے مناظرہ کروں میں نے اس کا ذکر اپنے والد سے کیا کہ چچا ایسا کہتے ہیں انھوں نے کہا جب تک حضرت امامؑ سے اجازت نہ لے لو ان کو وہاں نہ

لے جاؤ پس میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور ہشام کو حاضر کرنے کی اجازت چاہی تو حضرت نے اجازت دی پس یہ سن کر میں وہاں سے اٹھا اور چند قدم آیا تھا کہ مجھے ہشام کا بیہودہ اور بے ادبی سے کلام کرنا اور اپنے سامنے ان کا کسی کو خیال نہ کرنا یاد آ گیا میں ڈرا کہ کہیں وہ حضرت سے آ کر بے ادبانہ کلام نہ کرے پس میں حضرت کی خدمت میں واپس گیا فَحَدَّثْتُهُ رَدَائَتَهُ وَ خُبْثَهُ فَقَالَ لِیْ اَبُوْ عَبْدِاللّٰهِ عَلَیْهِ السَّلَامُ یَا عُمَرُ تَتَخَوَّ فُ عَلَیَّ فَخَجِلْتُ ۔ یعنی ہم نے حضرت سے مکرر واپس آ کر عرض کیا کہ یا حضرت یہ شخص نہایت خبیث اور ردی ہے جس پر حضرت نے فرمایا کیا تم ہم پر خوف کرتے ہو جس سے میں شرمندہ ہوا۔ غرض ہشام حاضر خدمت ہوا تو حضرت نے اس سے ایک مسئلہ پوچھا جس کے جواب سے وہ عاجز آ گیا اور کوئی جواب نہ دے سکا تب اس نے حضرت سے چند روز کی مہلت لی جب کسی سے جواب نہ مل سکا تو حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ نے خود اس کا جواب بتایا جس سے اس کی تشفی ہوئی پھر آپ نے دوسرا سوال کیا جس کے جواب میں وہ اسی طرح مبہوت ہو گیا تب تیسری بار چاہا کہ حاضر خدمت ہوئے آپ نے فرمایا فلاں وقت اس کو حیرہ میں لاؤ جو کوفہ کا ایک محلہ ہے وہاں آپ نے اس کا جواب دیا کہ وہ مستبصر ہوا فَانْصَرَفَ هِشَامٌ اِلٰی اَبِیْ عَبْدِاللّٰهِ علیہ السلام وَ تَرَکَ مَذْهَبَهُ وَ دَانَ دِیْنَ الْحَقِّ وَ فَاقَ اَصْحَابَ اَبِیْ عَبْدِاللّٰهِ کُلَّهِمْ وَ الْحَمْدُلِلّٰهِ۔ اور اپنے مذہب باطل کو چھوڑ کر دین حق میں داخل ہوا اور حضرت کے سب اصحاب پر فوق لے گیا۔''

رجال کشی ص ۱۶۶

یہ ہے ان کا ابتدائی حال کہ پہلے جہمی تھے اور تجسم خداوند عالم کے قائل تھے جس میں ان کو ایسا غلو تھا کہ وہ جانتے تھے کہ حضرت امامؑ کو اپنے زور تقریر سے قائل کر دیں گے مگر خدا نے انکی ہدایت کی اور صحبت امامؑ کی برکت سے راہ حق پر آئے اور جہمی سے ان کے اقبال علمی کا ستارہ چمکا اور علم کلام کے ایک ہیرو بن گئے۔

لیکن علماء متکلمین اہلسنت کو اشتباہ ہوا کہ انھوں نے آپ کا ابتدائی مذہب تجسیم اور تشیع لکھا ہے یعنی خداوند عالم کے صاحب اعضاء و اجسام ہونے کے معتقد تھے لہٰذا مجسمہ تھے اور حضرات ائمہ طاہرین علیہم السلام کی امامت کے قائل اور خلفائے ثلاثہ و بنی امیہ و بنی عباسیہ کی خلافت کے منکر و مبطل تھے لہٰذا شیعہ تھے اور اسی آخری عقیدہ کے سبب سے لوگوں نے آپ کو ابتدا ہی سے فرقہ شیعہ میں شمار کیا ہے حالانکہ اصلیت کے خلاف ہے کیونکہ پہلے وہ جہمی تھے یعنی حقیقت خلفائے ثلاثہ کے ساتھ مذہب جہم کے پیرو تھے بہ برکت ہدایت جناب امام جعفر صادق علیہ السلام شیعہ ہوئے لہٰذا یہ ان حضرات کی فاش غلطی ہے کیونکہ اسلامی فرقے جس طرح خلافت اور عبادت میں آپس میں مختلف ہیں اسی طرح الٰہیات میں بھی مختلف ہیں مثلاً اشاعرہ اور معتزلہ دونوں مقابل کے فرقے تھے اور آپس میں سخت مخالفت بلکہ عداوت تھی لیکن یہ مخالفت الٰہیات وغیرہ تک محدود تھی خلافت و امامت میں دونوں متفق یعنی سنی تھے۔ اسی طرح شیعہ اور معتزلہ امامت و خلافت میں مختلف ہیں لیکن الٰہیات میں قریب قریب متفق

ہیں یا ان دونوں فرقہ اہل حدیث وحنفی گو بمقابل شیعہ متفق یعنی سنی ہیں لیکن عبادات وغیرہ میں آپس میں نہایت درجہ مختلف ہیں کہ ایک فرقہ تقلید کا قائل ہے دوسرا اسے حرام جانتا ہے لہٰذا محض اعتقاد خلافت کے سبب سے کسی وہابی کو فرقہ حنفی میں شمار کر دینا کس طرح معقول ہوسکتا ہے اسی طرح ہشام بن الحکم جب (انھیں متکلمین کے خیال کی بنا پر) شروع میں تجسیم کے قائل تھے تو ان کا شمار شیعوں میں کس دلیل سے ہوسکتا ہے اس لئے کہ مذہب تشیع محض حضرات ائمہ طاہرینؑ کی امامت کے ہی اعتقاد کا نام نہیں ہے بلکہ بہت سے معتقدات کے مجموعہ کا اسم ہے جس میں خداوند عالم کے منزہ عن الجسم والجسمانیات ہونے کا اعتقاد بھی ویسا ہی داخل ہے جیسا کہ حضرات ائمہ طاہرینؑ کی امامت کا اعتقاد اور ظاہر ہے انتفاء جزء سے کل بھی (مِنْ حَیْثُ اِنَّہٗ هُوَ الْکُلُّ)
منتفی ہوجاتا ہے پس جو شخص خدا کو جسمانی اعتقاد کرتا ہو اس کو شیعہ شمار کرنا کیسی ناواقفیت ہے۔

یہ تقریر تو ہشام کے مجسمہ تسلیم کرنے کی بنا پر تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا مجسمہ ہونا بھی قابل وثوق اور موجب اطمینان ذرایع سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ کتب علم کلام کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے صرف مخالفین اور معاصرین کو مجوج کرنے کے لئے مختلف مواقع میں کچھ اس انداز سے کلام کئے جن سے لوگوں کو آپ کے متعلق دھوکہ ہوا اور غلطی سے آپ کی طرف تجسیم کی نسبت کر دی۔ چنانچہ عماد الملۃ والدین غفرانمآب مولانا السید دلدار علی صاحب اعلی اللہ مقامہ کتاب عماد الاسلام جلد توحید ص ۲۰۹ میں تحریر فرماتے ہیں ''ہشام بن الحکم کی طرف علمائے مخالفین نے مجسمہ ہونے کی جو نسبت دی ہے اس کی حقیقت حال یہ ہے جس کو جناب علم الہدیٰ سید مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنی کتاب شافی میں تحریر فرمایا ہے کہ ظاہر یہ ہے کہ لوگوں نے ہشام کا یہ قول نقل کیا ہے اِنَّہٗ جِسْمٌ لَا کَالْاَجْسَامِ یعنی خدا کا جسم ہے لیکن ایسا جسم جو تمام جسموں کے خلاف اور سب سے مغائر پس یہ قول تو ایسا ہے جو نہ تشبیہ ہے اور نہ کسی اسلامی عقیدہ اصولیہ کا توڑنے والا اور نہ کسی فرع اسلام پر اس سے اعتراض ہوسکتا ہے زیادہ سے زیادہ اس میں یہی خرابی نکالی جاسکتی ہے کہ انھوں نے تعبیر میں غلطی کی پس اس تعبیر کا غلط یا درست ہونا تو لغت کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے یعنی علم لغت ہی سے اس کا فیصلہ ہوسکتا ہے کہ جس طرح خدا کی ذات کو کہتے ہیں کہ اس کا وجود ہے لیکن ایسا وجود نہیں جیسا دنیا کی اور چیزوں کا وجود ہوتا ہے بلکہ ہر وجود سے مخالف اور سب کا مغائر اسی طرح یہ کہہ سکتے ہیں یا نہیں کہ خدا کا جسم ہے لیکن ایسا جسم نہیں جیسا دنیا کی چیزوں کا ہوتا ہے بلکہ ہر جسم سے مخالف اور سب کا مغائر پس جس طرح خدا کے متعلق کہا جاتا ہے کہ خدا کی ذات یا خدا کا وجود یا خدا کی ہستی ہے ان الفاظ سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کی ایسی ذات یا ایسا وجود یا ایسی ہستی ہے جو سب سے نرالی اور سب کے مخالف ہے اسی طرح ہشام کہتے ہوں گے کہ خدا کا جسم ہے لیکن ایسا جسم جو تمام اجسام کے خلاف ہے جس سے ان کی مراد خدا کی ہستی یا ذات یا وجود ہی تھا پس یہ صرف لفظ کا اختلاف ہے اور مسلم ہے کہ لَا مُشَاجَةَ فِی الْاِصْطِلَاحِ کسی

مقصود کے لئے کسی خاص لفظ کے وضع کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ہاں اعتراض اس وقت پیدا ہوتا جب ہشام اس امر کے قائل ہوتے کہ خدا کے اجسام ایسے ہیں جیسے آدمیوں یا جانوروں کے ہوتے ہیں یا ایسے افعال واوصاف خدا کے قائل ہوتے جن سے خدا کا جسم یا جسمانی ہونا ثابت ہوتا جیسا کہ دوسرے مجسمہ فرقہائے اسلام کے عقائد کی کیفیت ہے(۱)۔یہ تقریر تو اس تقدیر پر تھی کہ واقعاً ہشام کو قائل جسمیت خدا فرض کر لیں لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے کیونکہ ہمارے اور حضرات اہلسنت کے اکثر علمائے متکلمین کہتے ہیں کہ ہشام جسمیت خدا کے قائل نہ تھے بلکہ انھوں نے معتزلہ کو عاجز کرنے کے لئے برسبیل معارضہ ان پر اس قول کو وارد کیا تھا اور بطور الزام ان سے کہا تھا کہ اِذَاقُلْتُمْ اِنَّ الْقَدِیْمَ تَعَالیٰ شَیئٌ لَا کَالْاَشْیَاءِ فَقُوْلُوْا اِنَّہٗ جِسْمٌ لَا کَالْاَجْسَامِ یعنی جب تم لوگ اس امر کے معتقد ہو کہ خداوند عالم ایک چیز ہے لیکن دوسری چیزوں کے مثل نہیں تو پھر اس کا بھی اعتقاد کیوں نہیں رکھتے کہ خدا ایک جسم ہے لیکن دوسرے جسموں کے مثل ونظیر نہیں یعنی تم لوگ جب شیئیت خداوند عالم کا اعتقاد رکھنے میں کوئی خرابی نہیں سمجھتے تو جسمیت خداوند عالم کا اعتقاد رکھنے میں بھی کوئی خرابی نہیں ہے لہٰذا اس کا بھی اعتقاد کیوں نہیں رکھتے اور اس

---

(۱) جیسے شمس العلماء مولوی شبلی صاحب مسلمانوں کے مجسمہ فرقوں کے عقائد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عقائد میں جس طرح درجہ بہ درجہ تغیر ہوتا جاتا تھا اس کو ہم ایک خاص مسئلہ کی مثال میں بیان کرتے ہیں۔

پہلا درجہ۔خدا جسمانی ہے،عرش پر متمکن ہے اس کے ہاتھ ہیں منہ ہیں،خدا نے آنحضرتؐ کے دوش مبارک پر ہاتھ رکھ دیا تو آنحضرتؐ کو ہاتھوں کی ٹھنڈک محسوس ہوئی۔

دوسرا درجہ۔خدا جسمانی ہے اس کے ہاتھ ہیں منہ ہے ساق ہے لیکن یہ سب چیزیں ایسی نہیں ہیں جیسی ہماری ہیں۔'' علم الکلام ص ۱۵

یا جیسے علامہ ابن بطوطہ اپنے سفرنامہ مسمّی بہ رحلہ ابن بطوطہ مصر صفحہ ۵۷ میں علمائے دمشق کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''دمشق میں علمائے حنابلہ کے سرآمد اور سردار علامہ ابن تیمیہ تھے جو نہایت کبیر الشان ہیں اور بہت سے علوم جانتے ہیں مگر ان کی عقل میں فتور ہے چنانچہ ایک جمعہ کو ہم ان کی مجلس وعظ میں شریک ہوئے تو ابن تیمیہ نے اثنائے وعظ میں بیان کیا کہ خدا عرش سے آسمان دنیا پر اس طرح اترتا ہے جس طرح ہم اترتے ہیں یہ کہہ کر اوپر کے زینہ سے اتر کر دوسرے زینہ پر یہ کہتے ہوئے چلے آئے کہ اسی طرح خدا بھی آسمان پر عرش سے اترتا ہے۔'' یا جیسے علامہ محمد بن عبدالکریم شہرستانی اپنی کتاب ملل ونحل میں لکھتے ہیں ''وَمَثَّلَ مُضَرٌ کَھْمِشُ وَ اَحْمَدُ الْھَجِیْمِیُ وَ غَیرِ ھِمْ مِن اَھْلِ السُّنَّۃِ قَالُوْا مَعْبُوْدُھُمْ صُوَرَۃٌ ذَاتُ اَعْضَاءٍ وَ اَبْعَاضٍ اِلَخْ۔ یعنی مضر وکہمش واحمد ہجیمی وغیرہ اہلسنت اس امر کے قائل ہیں کہ ان کا معبود صورت دار ہے جس کے اعضاء بھی ہیں اور اجزاء بھی روحانی ہوں یا جسمانی وہ انتقال بھی کر سکتا ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ چلا جائے بلندی پر چڑھ سکتا ہے پستی میں اتر سکتا ہے استقرار وتمکن بھی اس کو حاصل ہے ان کی حکایت کو اشعری محمد بن عیسیٰ سے ناقل ہیں کہ مضر وکہمش واحمد ہجیمی خدا کے چھونے اور اس کے ہاتھ سے مصافحہ کرنے کو اور یہ کہ خالص مسلمان خدا سے معانقہ کرتے ہیں دنیا اور آخرت میں۔کبھی بعض لوگوں سے یہ حکایت نقل کرتا ہے کہ وہ لوگ اسی دنیا میں خدا کی زیارت کرتے

امر سے معمولی عقل والا شخص بھی واقف ہے کہ جو شخص اپنے مخالف سے بطور الزام و معارضہ کوئی بات کہے یا اس پر کوئی اعتراض وارد کرے یا اس سے کسی امر کو دریافت کرے تو اس سے یہ لازم نہیں آئے گا کہ وہ شخص اس قول یا سوال کا خود معتقد بھی ہے یا وہ اس کا دین و مذہب ہے۔

خلاصہ یہ کہ کسی کا وہی مذہب نقل کرنا چاہیے جو خود صاحب اپنی زبان یا تقریر و تحریر سے ظاہر کرے یا جسے اس کے اصحاب و پیرو بیان کریں یا معتمد علیہ اور موثوق بہ حضرات ایسے طریقہ سے نقل کریں جس سے اطمینان ہو سکے کہ ان لوگوں کو اس کا مذہب سمجھنے میں کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہوئی ہے برخلاف اس کے اگر اس شخص کے مخالفین سے اس کے مذہب کو دریافت کیا جائے گا تو دنیا میں کوئی مذہب بھی اپنی اصلی صورت میں نہیں معلوم ہو سکتا کیونکہ واضح ہے مخالف تو بدنما عنوان سے بیان ہی کرے گا اور چونکہ یہ ثابت ہو چکا کہ وہ پہلے جہمی تھے لہٰذا جو اقوال ان کے دربارۂ تجسم تھے وہ قبل کے تھے۔ علماء اہلسنت کو ایک شخص جو ایسا مل گیا کہ وہ شیعوں میں قائل بہ تجسیم ہے اس لئے بڑی آب و تاب سے کہا اور یہ نہ سمجھے کہ یہ اعتقاد ان کا قبل تشیع کا ہے یا بعد کا۔

علاوہ بریں بہت سی ایسی دلیلیں موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہشام ہرگز ان عقائد باطلہ کے معتقد نہ تھے چنانچہ ایک موقع پر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا تھا لَاتَزَالُ یَا هِشَامُ مُؤَیَّدًا بِرُوْحِ الْقُدُسِ مَانَصَرْتَنَا بِلِسَانِکَ کہ ہشام تم جب تک ہمارے دین اسلام کی نصرت اپنی زبان سے کرتے رہو گے اس وقت تک خداوند عالم کی مدد تمھارے شامل حال رہے گی اسی طرح جب ہشام ایک دفعہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہاں بہت سے علماء کبار اور مشائخ عظام مذہب شیعہ کے جمع تھے حضرت نے ہشام کو ان کل حضرات پر رفعت دی اور اپنی بغل میں بٹھایا حالانکہ اس وقت ہشام کو ان علماء واصحاب حاضرین سے سن میں سب سے چھوٹے تھے بعد ازآں حضرت نے ان لوگوں سے مخاطب ہو کر اور ہشام کی طرف اشارہ کر کے فرمایا هٰذَانَاصِرُنَا بِقَلْبِهٖ وَیَدِهٖ وَلِسَانِهٖ۔ یہ ہم

بقیہ حاشیہ ص ۴۰: ہیں اور خدا ان کی زیارت کرتا ہے اور داؤد جوالی سے حکایت ہے کہ وہ لوگوں سے کہتا تھا خدا کے جس عضو کو چاہو پوچھو لو صرف اس کی داڑھی اور فرج (علامت رجولیت یا انا ثیت) کے سوال سے معاف رکھو۔ یہ بھی اس کا مقولہ ہے کہ خدا کے جسم بھی ہے گوشت بھی ہے خون بھی ہے اور اعضاء و جوارح بھی ہیں۔ ہاتھ پیر سر زبان آنکھیں کان سب ہیں۔۔۔ خدا سینہ تک کھوکھلا اور سینہ سے نیچے ٹھوس ہے اسکے کانوں تک سیاہ گھونگر والے بال ہیں۔۔۔ خدا کی آنکھیں دکھنے آئیں تو ملائکہ نے اس کی عیادت کی۔ طوفان نوحؑ پر خدا اسقدر رویا کہ اس کی آنکھیں جوش کر آئیں۔ عرش پر خدا بیٹھتا ہے تو اس کے بوجھ سے عرش چرا اٹھتا ہے اور عرش کے چاروں طرف سے خدا کا جسم چار چار انگل باہر لٹکتا رہتا ہے یہ تمام تفصیل ملل ونحل شہرستانی میں ہے اور یہ سب عقائد فرقۂ مجسمہ کے ہیں جن سے تجسیم کی حقیقت واضح ہوتی ہے اور جس میں نہ کوئی تاویل ہو سکتی ہے اور نہ کسی قسم کے شک وشبہہ کی گنجائش نکلتی ہے۔ پس ہشام بن الحکم کے متعلق تو کسی نے بھی اس قسم کے عقیدہ کا ذکر نہیں کیا ہے اور نہ کوئی ایسی صفت خداوند عالم نقل کی ہے جس سے خدا کا جسم یا عضو ثابت ہو پھر کیونکر اس امر کا دعویٰ ہو سکتا ہے کہ ہشام کا مقصود جسم خدا کہنے سے ذات، ماہیت اور وجود خدا کے سوا بھی کچھ تھا۔ مؤلف

لوگوں کے ناصر ہیں اپنے دل سے، اپنے ہاتھ سے اور اپنی زبان سے اسی طرح ایک موقع پر فرمایا هِشَامُ بْنُ الْحِكَمِ رَائِدُ حَقِّنَا وَ سَائِقُ قَوْلِنَا الْمُوَيِّدُ لِصِدْقِنَا اَلدَّافِعُ لِبَاطِلِ اَعْدَائِنَا فَمَنْ تبعَهُ وَ تَبعَ اَمْرَهُ تَبِعْنَا وَ مَنْ خَالَفَهُ وَ الْحَدَ فِيْهِ فَقَدْ عَادَانَا وَ اَلْحَدَ فِيْنَا یعنی ہشام بن الحکم ہم لوگوں کے حق کے طلب کرنے والے اور ہم لوگوں کی تعلیمات کے شایع کرنے والے، ہمارے صدق کی تائید کرنے والے ہمارے دشمنوں کے باطل کے دفع کرنے والے ہیں پس جو ان کا اور ان کے امر کا تابع ہوا اس نے ہماری بیعت کی اور جس نے اس کی مخالفت کی اور ان کے بارے میں ملحد ہوا اس نے ہم سے دشمنی رکھی اور ہمارے بارے میں ملحد ہوا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی دلیلیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ مباحثہ ومناظرہ اور غور وفکر میں لوگوں کو ان کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیتے رہتے تھے اور ان سے ملاقات کرنے اور ان کے مناظرات ومباحثات سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب وتحریص کرتے رہتے تھے پس جب آپ کی یہ جلالت قدر ہو تو کسی فہمیدہ شخص کو کیونکر تو ہم ہو سکتا ہے کہ ہشام جسمیت خدا کے قائل تھے اس لئے کہ اگر واقعاً وہ ایسے تھے تو پھر کل اعتراضات دراصل حضرت صادقؑ پر وارد ہوتے ہیں کہ کیونکر حضرت ایسے گمراہ شخص کی بیعت کی تعلیم لوگوں کو دیتے اور ان سے علوم حکمت وکلام حاصل کرنے کی تاکید فرماتے تھے بلکہ خود رسول اللہ پر کہ آپ نے ایسے حضرات کے ساتھ تمسک کا حکم دیا اسی طرح علامہ مجلسی علیہ الرحمہ مخالفین کے ان اقوال کو نقل کرنے کے بعد جن سے وہ لوگ ہشام کو عقیدۂ جسمیت خدا کے ساتھ متہم کرتے ہیں تحریر فرماتے ہیں لا ریب فی جلالۃ قدر الھشامین و برائتھما عن ھذین القولین۔ یعنی ہشام بن الحکم اور ہشام بن سالم کی جلالت قدر میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا اور بلا شک وریب وہ حضرات ان عقائد تجسیم وتشبیہ سے بری تھے اور ہرگز اس قسم کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے اسی سبب سے جناب مرتضیٰ علیہ الرحمہ نے نہایت شد ومد سے ان کو اس عقیدہ سے بری ثابت کیا ہے اور ایسے دلائل وبراہین عقلیہ ونقلیہ اس پر نقل فرمائے ہیں جن کے دیکھنے کے بعد اس اعتراض کے محض تہمت وبہتان ہونے میں کوئی شبہہ نہیں رہتا۔ پس بظاہر اس غلط شہرت کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ اس زمانہ میں علماء متکلمین ان کے مناظرات ومباحثات سے مغلوب ہو کر ان کے سخت مخالف ہو گئے تھے اور ان کے شیعہ تبرائی ہونے نے ان لوگوں کے بغض وعناد کو اور بھی بڑھا دیا تھا لہٰذا صرف بدنام کرنے کے لئے ان دونوں قولوں (تجسیم اور تشبیہ) کو ان کی طرف منسوب کر دیا جیسا کہ انھیں کی طرح بہت سے غلط امور جناب زرارہ اور دوسرے اکابر محدثین کی طرف بھی منسوب کر دئے گئے تھے اگرچہ ہم کو اس امر سے بھی انکار نہیں ہے کہ ممکن ہے ان لوگوں نے عمداً اور تعصب سے امر کو شہرت نہیں دی ہو بلکہ غلط فہمی ہو گئی ہو کیونکہ جن لوگوں نے منشاء عقیدہ تجسیم کو ذکر کیا ہے وہ ان کا صرف یہ قول بیان کرتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ جَسْمٌ لاَ کَالاَجْسَامِ وَ صُوْرَۃٌ لَا کَالصُّوْرَۃِ کہ خدا جسم ہے لیکن ہر جسم سے مخالف اور صورت ہے مگر ہر صورت سے مغائر۔ پس اگر انھوں نے اس قول کو اپنے مختار کے طور کہا بھی ہو تو شاید ان کا مقصود جسم سے ایک حقیقت بالذات اور صورۃ سے ماہیۃ رہا ہو اور اس میں

کوئی کلام نہیں کہ خدا حقیقتاً قائم بالذات ہے اور اس کی کوئی ماہیت بھی ہے۔ پس یہ تو عین عقیدہ اسلام اور تعلیم ایمان ہے۔

لیکن ان بیانات سے اطمینان نہ ہو جب بھی ہشام موردِ طعن قرار نہیں پا سکتے کیونکہ مسلم ہے کہ وہ ابتدائی عرصہ تک اپنے ہی کسب کردہ علم و عقل پر عمل کرتے رہے پس اسی زمانہ میں ممکن ہے اپنی سمجھ سے یا اپنے اساتذہ کی تعلیمات کے اثر سے تجسیم و تشبیہ کے شبہ میں بھی مبتلا رہے ہوں یہاں تک کہ بخت بیدار نے کسی تقریب سے حضرت امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں پہنچایا اور جب علم و حکمت، معرفت و حقیقت کے اس بحر ذخار کے سامنے اپنے علم کو مثل جزو قطرہ کے پایا تو اپنے ان عقائد باطلہ سے توبہ کر کے مومن کامل اور شیعہ خالص قرار پائے اور صحبت و شاگردی حضرت امامؑ کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔ پس کسی شخص کے ترک کردہ عقیدہ کو بعد میں بھی اس کی طرف نسبت دیتے رہنا کیونکر معقول ہو سکتا ہے ورنہ پھر جتنے جلیل القدر حضرات ابتدائے اسلام سے اس وقت تک کفر ترک کر کے حلقۂ اسلام میں داخل ہوتے رہے ہیں وہ بھی اپنے سابق کفر کے سبب سے موردِ طعن و تشنیع قرار پا جائیں گے اور پھر یہ سلسلہ بہت دور تک پہونچ جائے گا۔

اس کشمکش اور سراسیمگی کے درمیان اسلامی حلقے کی تازہ تحریک خصوصاً مجاہد علماء اور پختہ عزم روشن خیال حضرات کی کوششوں سے مختلف اسلامی ملکوں میں وسیع مذہبی تنظیمیں بنیں جنھوں نے ان دو خطرناک رجحانات کے مقابلے پر ڈٹ کر جوانوں کے سامنے زندگی کا فلسفہ اور اس کے نصب العین کی وضاحت کی اور انھیں اسلامی قدروں سے روشناس کرایا۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جوانوں میں فرنگی قابی کی جو تباہ کن لہر چل پڑی تھی اس پر روک لگ گئی اور انھیں اخلاقی گراوٹ سے بچا لیا گیا، اس نسل کے کھنڈرات پر ایمان کی نئی عمارت کھڑی ہوئی، جوانوں کا شعور پروان چڑھا اور نئی پود مشرق و مغرب کی سامراجی طاقتوں اور ان کے اندرون ملک کارندوں کے باوجود ساری دنیائے اسلام میں اسلامی تحریکوں کی طاقت ور پشت پناہ ثابت ہوئی، اہل انقلاب اور اسلامی معاشرے کی معمار بنی۔ (جاری۔۔۔)

❀❀❀

میر انیسؔ کا جناب مفتی علامہ میر عباس سے تلمذ

ایک سوالیہ نشان

فاضل نبیل جناب چودھری سبط محمد نقوی صاحب

میر انیس کی روداد زندگی میں جو سوالات حل طلب ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کیا انیس کو مفتی علامہ میر محمد عباس شوستریؒ سے شرف تلمذ تھا؟ جہاں تک نظر قاصر ہے اس سوال سے تین فریق وابستہ ہیں۔ایک مرزا دبیر کے طرف دار جن میں افضل حسین ثابتؔ صاحب حیات دبیر اور مولوی سردار مرزا، مصنف رد واقعات انیس کو نامزد کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے مفتی علامہ اعلی اللہ مقامہ کے قدرداں جیسے مرزا محمد ہادی عزیزؔ جو تاریخ عباس یعنی تجلیات سوانح مفتی علامہ کے مؤلف کی شہرت رکھتے ہیں۔تیسرے فریق ہیں خانوادۂ انیس کے متاخرین جو مفتی علامہ کے حضور میں میر نفیسؔ کی شاگردی تک کو خلاف شان سمجھتے ہیں ۔ وہ میر انیس کے تلمذ پر کب راضی ہو سکتے ہیں!

اس سوال کے جائزے کے لیے ضروری ہے کہ ہم مفتی علامہ سے بخوبی متعارف ہو لیں ۔ہم درس نظامی کے بوریا نشین مفتی علامہ کی نسبت اپنے تصورات کا اظہار کریں تو وہ آج مبالغہ آمیز سمجھا جاسکتا ہے لہٰذا ہم یہاں انیس کے عارف کامل پروفیسر نیر مسعود سے مدد لیتے ہیں جن کی شاہکار تصنیف ''انیس'' (سوانح) کا اس وقت غلغلہ بلند ہے اور حق یہ ہے کہ وہ کتاب ہے بھی اسی کی مستحق ۔نیرؔ صاحب لکھتے ہیں: ''خاندان اجتہاد کے علاوہ لکھنؤ میں جو مجتہد اور علماء تھے ان میں سب سے غیر معمولی اور اہم شخصیت مفتی میر محمد عباس کی تھی جو مذہبی، علمی، ادبی تینوں حیثیتوں سے لکھنؤ کے اکابر کی پہلی صف میں تھے۔وہ عربی، فارسی اور اردو کے شاعر اور انشاء پرداز بھی تھے ۔سید تخلص کرتے تھے غالب کے ساتھ بھی ان کے مراسم تھے.....'' (انیس (سوانح) ص ۲۰۰)

نیرؔ صاحب کے ارشاد کی تائید میں ہم یہاں غالب کے ایک خط کے چند جملے نقل کرتے ہیں جس سے پتہ چلے گا کہ مرزا غالب، مفتی علامہ کو کس پائے کا سخن سنج اور فارسی داں سمجھتے تھے۔ملاحظہ ہو:

''......آپ کی تحسین میرے واسطے سرمایۂ عز وافتخار ہے لیکن فقیر امیدوار ہے کہ یہ دفتر بے معنی (قاطع برہان) نہ سراسری بلکہ سراسر دیکھا جائے ۔پیش نظر دھرا رہے وقت فرصت اکثر دیکھا جائے میں نے جو یہ نسخہ وہاں بھجوایا ہے گویا کسوٹی پر سونا چڑھایا ہے.....'' (تجلیات ۲/۱۹۵)

مجھے اندیشہ ہو رہا ہے کہ اگر اس طرح کے شواہد جمع کیے جائیں تو طول ممل ہو جائے گا لہٰذا میں صرف میر انیس کے نذرانۂ عقیدت تک اس گفتگو کو محدود رکھنا چاہتا ہوں ۔مفتی علامہ نے اپنی مثنوی من وسلوٰی کی طباعت کی تاریخ کہنے کی

میر انیس سے فرمائش کی ،انیس نے تعمیل کی ۔'' کلام بے نظیر'' مادۂ تاریخ برآمد کیا۔ قطعے میں جوابیات کہے۔ ان میں سے دو آپ ملاحظہ فرمائیں:

حسب حکم سید معجز بیاں
قبلۂ کونین استادِ زماں
فاضل باذل فقیہ بالیقیں
آفتاب آسمان علم دیں

مثنوی پڑھنے کے بعد مفتی علامہ کی خدمت میں جو مکتوب بھیجا، اس کے بھی چند فقرے حاضر ہیں:

''قبلہ وکعبہ خلوص کیشاں دام ظلکم العالی زباں ایں کج مج بیان راچہ یارا کہ مدح ایں اشعار آب دار نماید کہ دریں جزو زماں طرز اعجاز طرازی وسحر پردازی برذات فیض آیات ختم گردیدہ'

موقلم بودہ است گوئی کلک معجز سلک تو
صفحۂ قرطاس راکردی نگارستان چیں

ازعین الکمال نگاہ داشتہ سایۂ ہما پایہ رابرمفارق خادمان خاص مبسوط دارد۔'' (ایضاً ۲/ ۱۹۱)

قبلہ وکعبہ، قبلۂ کونین، استاد زماں، آفتاب علم دیں ذات فیض آیات ایسے القاب ہیں جو مفتی صاحب کی برتری کی واضح شہادت ہیں۔

یہ خیال کرنے کی گنجائش نہیں کہ مفتی علامہ سن میں میر صاحب سے بزرگ رہے ہوں گے اور یہ القاب و آداب اس بزرگی کا لازمہ ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میر صاحب کی ولادت ۱۲۱۸ھ کی ہے، مفتی علامہ کی ۱۲۲۴ھ کی۔ اس طرح انیس کے چھ سال مفتی علامہ سے بزرگ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس لیے ماننا پڑے گا کہ یہ سب مفتی علامہ کے علم وفضل کی بدولت ہے، سن کی بزرگی سے نہیں۔

مناسب ہے کہ ہم یہیں دیکھ لیں کہ جناب مفتی علامہ کی نظر میں میر انیس کے کمال فن کا رتبہ کیا تھا۔ انیس مفتی علامہ کے مخلص ہم نشینوں میں سے تھے مگر ایک اتفاقی حادثہ ایسا پیش آگیا جس کی شکر رنجی کی تلخی اس حد تک پہنچی کہ انیس نے مفتی علامہ کا ایک مکتوب یہ شعر لکھ کر واپس کر دیا کہ:

مرنجاں دلم راکہ ایں مرغ وحشی
زبامے کہ برخواست مشکل نشیند

مفتی علامہ نے اسی زمین میں ایک قطعہ کہا اور میر صاحب کو منانے کی بھرپور کوشش کی۔ دلداری کی پوری کوشش کے باوجود مفتی علامہ کا انداز کہیں معذرتی نہیں ہے۔ افہام و تفہیم اور صورتِ حال کی وضاحت وصراحت کا ہے۔

پورا قطعہ تو نظر قاصر سے نہیں گذرا۔ واقعات انیس میں مہدی حسن احسنؔ نے جو شعر نقل کیے ہیں، ہم اس سے منتخب شعر پیش کر رہے ہیں:

نوشتی کہ دل ہست چوں مرغ وحشی
زبامیکہ برخواست مشکل نشیند
تو اے گل نئی مرغ وحشی انیسی
چہ باشد کہ گل با عنادل نشیند
تو فرزند مشکل کشائی پس ایں مرغ
ہم آساں نشیند نہ مشکل نشیند
دلت بود جائے من و نیست باور
کہ بر جائے من کینہ در دل نشیند

تو گفتی میازار دل را کہ ایں مرغ
زبامیکہ برخواست مشکل نشیند
سرت گردم آزار عاشق چہ باشد
بجز ایں کہ بر درچو سائل نشیند
زفضل و کمال تو برخواست شورے
چرا کینہ با ایں فضائل نشیند
سرشکے نہ ریزد فغانے نہ خیزد
اگر بے تو صد کس بہ محفل نشیند
کہ بے خسر و ملک شیریں بیانی
تہ شیشہ زہر ہلاہل نشیند
سخن مختصر اینکہ ایرانیاں را
نیابد چنیں کینہ دردل نشیند
تو چوں بحر درجوش لب تشنہ سیدؔ
بدر یاردیابہ ساحل نشیند

یہ شکر رنجی اس لیے ہوئی تھی کہ ایک جگہ میر صاحب کے صاحبزادے میر محمد سلیس کا رشتہ طے تھا مگر وہ بعد میں منقطع ہوگیا اور عقد مفتی علامہ کے فرزند سید محمد وزیر سے ہوا۔اس واقعے کی تفصیل کئی طرح بیان کی جاتی ہے۔ ہم اس کے جائزے کو اپنے موضوع بحث سے خارج سمجھتے ہیں لیکن یہ ضرور عرض کریں گے کہ یہ واقعہ مطابق بیان تجلیات وقراءت نیر مسعود شعبان ۱۲۶۹ھ کا ہے۔اس کے بعد دونوں اہل کمال میں صفائی ہوگئی لیکن جب ۱۲۷۰ھ میں میر انیس نے عزاخانہ بنوایا تو مفتی علامہ نے اس کی تاریخ کہی اور اس قطعے میں بھی یہ اشارہ کیا کہ میر صاحب کان کے کچے ہیں اور یک طرفہ رائے قائم کر لیتے ہیں۔دو شعر یہاں حاضر ہیں:

نازک دلے کہ ہر چہ بگفتند گوش کرد
اما نہ حال زار من ناتواں شنید
نشنید نیم حرف ہم از سرگذشت من
از دیگراں اگر چہ دو صد داستاں شنید

لیکن اس قطعے میں بھی میر انیس کے کمالات کا جی بھر کے اعتراف ہے، مرثیہ گوئی کا ہی نہیں مرثیہ خوانی کا بھی، ملاحظہ ہو:

یکتائے عصر ببر علی آں کہ مثل او
نے چشم چرخ دید نہ گوش جہاں شنید
آں سید انیسؔ لقب عندلیپ ہند
کاوصاف او تو اں ززمیں وزماں شنید
ہرجا کہ خواند مرثیہ از بام و در تمام
گرسنگ خارہ بود ازاں ہم فغاں شنید

یکتائے عصر، عندلیپ ہند وغیرہ سے زیادہ ان کے کمال کا اعتراف اور کن لفظوں میں مفتی علامہ فرما سکتے تھے!

انیس کے اعتراف کمال بلکہ مفتی علامہ کے زبان و قلم سے، ستائش و مدح سرائی کا ذکر چھڑ گیا ہے تو پھر یہیں میر صاحب کی تعزیت گزاری کا نمونہ دیکھ لیجیے۔میر نفیس مفتی علامہ کے شاگرد تھے، درسیات تو حاصل کیے ہی تھے، فارسی منظومات میں مفتی علامہ سے اصلاح لیتے تھے۔اپنے والد مرحوم کے رثا میں نفیس نے شیخ حزیں کے ایک قطعے کو مخمس کیا مفتی علامہ نے اصلاح کر دی بعد میں اس زمین میں بھی خود بھی ایک مخمس نظم فرمایا۔آپ بھی اس کے کچھ بند ملاحظہ

فرمائیں:

از خامہ اورایت سلطان سخن بود
درقبضہ او صارم سلطان سخن بود
در مجلس او زینت ایوان سخن بود
ازصحبت او بندش ارکان سخن بود
ازرحلت اوقدرت وامکان سخن رفت

دربزم عزا آئینہ دار شہدا بود
تصویر کش معرکۂ کرب و بلا بود
باخلق حسن بود انیس الغربا بود
درمرثیہ گوئی خضر راہ نما بود
اورفت کہ سرچشمۂ حیوان سخن رفت

آگے بڑھنے سے پہلے ہم آپ کوتوجہ دلا دیں یا کم سے کم اپنی رائے ظاہر کردیں کہ استاد اپنے شاگرد کی شاباشی وستائش میں سب کچھ کہہ سکتا ہے مگرفن میں ''خضرراہ نما'' کبھی نہ کہے گا۔یہی ایک بڑی شہادت ہے کہ میرانیس مفتی علامہ کے شاگرد نہ تھے۔

دوسری بات یہ قابل غور ہے کہ نفیس نے مفتی علامہ سے درسیات حاصل کیے۔فارسی کلام پر اصلاح لی، اردو میں تلمذ کیوں نہ اختیار فرمایا؟ باپ کے استاد سے بیٹے کو سیکھنے میں کیا حجاب تھا۔میر انیس جو زبان استعمال کرتے تھے، اسے اپنے گھر کی زبان کہتے تھے، اپنے گھر کی زبان میں وہ مفتی علامہ سے کیا استفادہ کرتے۔ہم آگے بڑھ کر اس سوال پر پھرنظر ڈالیں گے ابھی تو تعزیتی اظہار خیال کا تذکرہ تمام کرنا ہے۔

مفتی علامہ نے وفات انیس کے متعدد قطعات کہے، ایک قطعے میں مادۂ تاریخ کا مصرع ہے:

گلزارجناں رفت کنوں بلبل ہند

ایک تاریخ خود انیس کی مشہور رباعی سے نکالی ہے:

ہائے جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا

اب آیئے اس فریق کے بیان کا جائزہ لیں جو اس کا دعوے دار ہے کہ میر صاحب، مفتی علامہ کے شاگرد تھے۔اس کے سرخیل صاحب ردواقعات انیس مولوی سردار مرزا ہیں، لکھتے ہیں:

''مفتی صاحب نے بارہا فرمایا کہ میرانیس میرے شاگرد تھے۔لوگوں نے پوچھا کہ کوئی کتاب فقہ میں پڑھی تھی؟ فرمایا نہیں، بلکہ سلام و مرثیے وغیرہ پر اصلاح لیتے تھے''(ردواقعات انیس ص ۲۴)

یہ روایت معرکۂ انیس و دبیر میں وضع ہوئی ہے اور بالکل خلاف قیاس ہے۔مفتی علامہ اگر یہ لوگوں سے فرماتے تو سب سے پہلے ان کے داماد اور ان کے ساختہ پرداختہ جانشین نجم العلماء مولانا نجم الحسن سنتے، وہ سنتے تو اس کا ذکر تجلیات میں شدومد سے ہوتا۔تجلیات کا رجحان یہی ہے کہ مفتی صاحب کے ذرے کو خورشید خاور بنا کر پیش کیا جائے اس میں کہیں کہیں حفظ مراتب بھی نظر انداز ہو گیا ہے تجلیات سے خانوادۂ غفرانمآب نے دل آزاری محسوس کی اور اس کی تیز و تند تنقید لکھی جو مرحوم راز اجتہادی سے منسوب ہے، نام ہے برق طور یعنی نقد تجلیات۔

پھر فرمایا تو بارہا مگر نام ایک شخص کا بھی نہیں کہ کس

سے فرمایا اس پر مستزاد یہ کہ میرے شاگرد ''تھے''۔ یعنی زندگی بھر راز رکھا، بعد وفات بھانڈا پھوڑ دیا۔ اس اخلاقی کمزوری کا مفتی علامہ کی نسبت کون اعتبار کرے گا؟ استغفر اللہ۔

دوسرے صاحب ہیں میر افضل حسین ثابت، حیات دبیر کے مصنف، بچارے ناجانبداری و معروضیت کا لبادہ اوڑھنے کی بڑی کوشش کر رہے ہیں۔ سوچ سمجھ کے پڑھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ سخن فہم نہیں دبیر کے کٹر طرفدار ہیں۔ ان کا ایک بیان کہیں نظر سے گذرا ہے۔ ماخذ اس وقت سامنے نہیں کہ مفتی علامہ کے فرزند مولوی سید محمد وزیر صاحب نے آگرہ میں ان سے بیان فرمایا کہ انیس مفتی علامہ سے اصلاح لیتے تھے مگر ان کا ایک دوسرا بیان اصلاح کی حقیقت کھول دیتا ہے وہ یہ ہے، مرزا عزیز لکھتے ہیں:

''ثابت صاحب بیان فرماتے ہیں کہ ہم سے خود وزیر صاحب ۱۸۸۴ء میں بہ مقام آگرہ شاہ گنج ناقل تھے کہ میر انیس نے مفتی صاحب کو مرثیہ سنایا، اس میں مصرع تھا:

جب حملہ ور امام کریم النفس ہوئے

مفتی صاحب نے فرمایا کریم النفس نہیں مسیحا نفس کہیے۔

سوال اٹھتا ہے کہ جب اصلاح بہ صیغہ راز تھی، میر انیس کے متعدد ملازموں میں سے صرف خدا بخش ایک پوٹلی مفتی علامہ کے یہاں لے جاتے تھے اور لے آتے تھے اور مفتی علامہ باقاعدہ اصلاح سے مزین فرماتے تھے تو پھر اس کا موقع کیسے آیا کہ انیس مرثیہ سنائیں اور مفتی علامہ اصلاح نہیں ایک لفظی ترمیم کی صلاح دیں۔ یا ثابت صاحب یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اصلاح کا معاملہ علانیہ تھا، اگر علانیہ تھا تو پھر خدا بخش کی پوٹلی کہاں جائے گی! پھر یہ سوال بھی ہے کہ جب مفتی علامہ کی اقامت کان پور یا مٹیا برج میں تھی تو کون اصلاح دیتا تھا! جناب مفتی علامہ کے روز ناچے کے جو اوراق تجلیات میں نقل ہوئے ہیں اس میں ایسا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ البتہ ایک ذیلی سرخی ہے ایک مصرعے کی اصلاح، شعر یہ تھا:

نام روشن کر کے میں چپ ہو گیا مانند شمع
ناموافق تھی زمانے کی ہوا میرے لیے

مصرعۂ اولیٰ کو یوں بنایا گیا ہے:

ہو گیا خاموش مثل شمع روشن کر کے نام (صفحہ ۳۸،۱۱)

مرزا عزیز شاعر کا نام نہیں بتاتے مگر یہ شعر میر انیس کا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب نے یہ اصلاح قبول نہیں فرمائی غالباً خود ترمیم کی۔ انیس کے سلام (مرتبہ علی جواد زیدی) میں مصرع یوں لکھا ہے:

نام روشن کر کے بجھ نہ جانا مثل شمع

آپ توجہ فرمائیں کہ جہاں ایک ایک مصرعے کی اصلاح کا ریکارڈ ہو وہاں انیس ایسے خدائے سخن کی شاگردی راز رہ سکتی تھی جب کہ تجلیات کا حلقۂ تالیف بھی اس کا متمنی ہے کہ کسی نہ کسی طرح دبیر کے طرفدار ثابت کی ہی زبانی ثابت ہو جائے کہ میر انیس، مفتی علامہ کے شاگرد تھے۔ اب خانوادۂ انیس کے حضرات بھی نفیس کے مفتی علامہ سے تلمذ کو خلاف شان سمجھتے ہیں، لیکن تجلیات کے باب التلامذہ میں میر خورشید علی کا نام بہ ایں تفصیل شامل ہے:

میر خورشید علی نفیس فرزند حضرت انیس مرحوم جناب مفتی صاحب مرحوم سے پڑھا بھی اور

منظومات فارسیہ پر اصلاح بھی لیتے تھے ۔ چنانچہ باب الاصلاح میں اکثر نظمیں ان کی درج ہیں ۔ جناب میر ببر علی صاحب انیس بھی اکثر استفادات حاصل کیا کرتے تھے۔''

اگر سنانے کی روایت قبول بھی کر لی جائے تو میر انیس کا مفتی صاحب کو اپنا کلام سنانا اس نوعیت کا ماننا ہوگا جیسا کہ غالب نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کو اپنا کلام سناتے تھے اور جب تک وہ پسند نہ کر لیتے غالب دیوان میں وہ غزل لکھتے نہ تھے اور اس بات پر ناز کرتے تھے۔

مفتی علامہ تو ایسے بحر العلوم تھے کہ ان کی وسعت نظر و اطلاع پر ان کے اساتذہ اجلہ بھروسہ کرتے تھے اور تلاش وتحقیق کا حکم دیتے تھے ۔ روایات کی درایت ، عرفان و تصوف کے شرعی حدود، مخفی علوم کے مانند بہت سے موارد میں میر انیس کا مفتی علامہ سے استفادہ عین ممکن ہے لیکن اردو مرثیے اور سلام کو بغرض اصلاح جناب کے ملاحظے میں پیش کرنا قابل قبول نہیں، جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے ۔ جب اردو کلام پر نفیس نے مفتی علامہ سے اصلاح نہیں لی تو میر صاحب کے لیے یہ تصور کیسے کیا جا سکتا ہے ۔ میر نفیس کی شاگردی کی روایت غلط ہوتی تو بزرگان خانوادہ یا کم سے کم میر نفیس کے صاحبزادے دولھا صاحب عروج اس کی تردید ضرور کرتے ۔ تجلیات عروج مرحوم کی حیات میں شائع ہو چکی تھی اور خانوادۂ اجتہاد کے اختلاف و احتجاج کے باعث اچھے خاصے چرچے میں تھی۔

راقم کم سواد کی نظر میں تو انیس، دبیر، عشق کوئی بھی مفتی علامہ سے تلمذ حاصل کرتا تو اس کے لیے شرف ہوتا لیکن ان حضرات میں سے کوئی بھی مفتی علامہ کا شاگرد نہ تھا۔ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں اب قدرے تفصیل سے تکرار مطلب کرتے ہیں کہ کیا میر انیس ایسے عالی ظرف ، خوددار مداح اہلبیت سے یہ بات ممکن تھی کہ وہ شاگردی کو مخفی رکھیں خاص کر نہایت نازک و حساس محل پر! اس سوال کا جواب ہم تجدید مراسم کے ذیل میں مرحوم شاد عظیم آبادی کے بیان میں پا سکتے ہیں ۔ پروفیسر نیر مسعود ''فکر بلیغ'' صفحہ ۲۴۵ کے حوالے سے شاد کی زبانی مفتی علامہ کے فرزند سید محمد وزیر کا بیان نقل کرتے ہیں:

''ایک دن میرے گھر کے قریب میر صاحب کے پڑھنے کی مجلس تھی ۔ مفتی صاحب خبر ملتے ہی سویرے وہاں سے چلے گئے تا کہ میر صاحب پر اثر پڑے ۔ میر انیس جو منبر پر گئے تو مفتی صاحب کو دیکھ دل بھر آیا ۔ مرثیہ نکالا اور زانو پر رکھا اور لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ کون کہتا ہے علماء شاعری میں لائق نہیں ہوتے ۔ کئی علماء کے اشعار پڑھے اس ضمن میں مفتی صاحب کے بھی اشعار پڑھے اور خوب تعریفیں کیں گویا صلح ہوگئی ۔ بعد مجلس مصافحہ ہو کر پھر وہی محبت اور ربط قائم ہوگیا۔'' (انیس (سوانح) ص ۲۳۱)

تلمذ کی کوئی بھی حقیقت ہوتی تو اس وفور جذبات کے عالم میں میر صاحب اس کی طرف اشارہ کرنے سے باز نہیں رہ سکتے تھے۔

اس سوال پر ایک خاص نظر سے غور فرمانے کی میں آپ سے درخواست کروں گا۔ انیس و دبیر بلکہ ان کے کافی بعد تک طبقاتی تقسیم میں سب سے محترم و معزز طبقہ ہمارے

معاشرے میں علمائے کرام کا تھا۔ انیس و دبیر ذی علم و کمال بزرگ تھے، حضرات علماء ان کا احترام فرماتے تھے ابھی آپ انیس کے بارے میں مفتی علامہ کی ثناء گری ملاحظہ فرما چکے۔ لیکن ان تین معاصروں میں آغا عشق کی عالمانہ حیثیت تھی۔ آپ یہ ذکر پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

''عشق کی علمی استعداد اچھی تھی۔ عربی فارسی ادب، منطق، علم کلام میں کافی دست گاہ رکھتے تھے، عروض کے بڑے ماہر تھے، مذہبیات کا کافی علم رکھتے تھے اور اخباری شیعہ تھے۔ مولوی محمد حسین محقق ہندی کے والد ایک ذی علم بزرگ عشق کے ہم محلہ تھے، ان سے فقہ کی ایک دقیق کتاب پر مذاکرہ ہوا کرتا تھا۔ شہر کے ممتاز علماء، شعراء، رؤسا سے عشق کے تعلقات تھے۔ سلطان العلماء مولانا سید محمد مجتہد العصر جو صیغۂ فوج داری کے حاکم اعلیٰ تھے، ہر شب جمعہ کو عشق سے ملنے آتے تھے۔'' (نگارشات ادیب ص ۶)

اب ان میر عشق کا حال ملاحظہ فرمائیں، ہوا یہ کہ:

''علامہ غلام حسنین کنتوری مرحوم نے اردو لفظوں کی تذکیر و تانیث کے متعلق ایک جامع کتاب شواہد اردو کے نام سے لکھنا شروع کی۔ آب (پانی) اور آفتاب (سورج) کے لیے میر عشق سے ناسخ کے کلام سے سند مانگی، انھوں نے ناسخ کا ایک مصرع اور ایک شعر لکھ بھیجا، جو حسب ذیل ہیں:

حرم سے جس طرح لاتے ہیں آب زمزم کا

ماہ کامل ہے ترے منہ دھونے کی سیلابچی

آفتاب اے ماہِ تاباں آفتابہ ہوگیا

علامہ نے میر عشق کو لکھا اس شعر سے آفتاب کی تذکیر جب ثابت ہوگی جب آفتاب کا آفتابہ ہونا مراد لیا جائے لیکن شاعر نے جس طرح پہلے مصرعے میں سیلابچی کو ماہ کامل بنایا ہے، اسی طرح دوسرے مصرعے میں آفتابہ کو آفتاب قرار دیا ہے میر عشق نے جواب میں لکھا کہ ہم لوگ علماء کے سامنے منہ کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتے میں آپ کی ہدایت سے مستفید ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ اس شعر کو آفتابہ کی تذکیر کی سند قرار دینا بہتر ہے۔''

(بحوالہ سوانح عمری علامہ کنتوری حصہ اول ص ۶-۱۷۵)

اب اس بحث کو دیکھیں کہ میر انیس مفتی علامہ میر عباس کے شاگرد تھے یا نہیں۔ اگر نہیں تھے تو مفتی علامہ کے اعزاز میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر تھے تو بھی مفتی علامہ کے اعزاز میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا ہاں میر انیس کا شرف یقیناً بڑھ جاتا ہے۔ مگر اس ناکارہ قلم کش کی رائے میں میر صاحب تلمذ کا وہ شرف حاصل نہ کر سکے جو حالی کو مرزا غالب کے تلمذ سے تھا۔ یقیناً حالی جتنا شیفتہ سے مستفیض تھے اس سے زیادہ انیس مفتی علامہ سے مستفیض رہے ہوں گے۔ ہاں! حالی میر کے مقلد تھے، انیس کا ترانہ یہ تھا:

جد و آبا کے سوا اور کی تقلید نہ ہو

اسی پر ان کا عمل رہا اور یہی تاکید انھوں نے اپنے اخلاف سے کی۔

☆☆☆

منقبت

درمدح حضرت ابوطالبؑ

ڈاکٹر عباس رضا نیرؔ جلالپوری صاحب

کیا کہوں قدرت سے کیا رشتہ ابوطالبؑ کا ہے
سب کا جو قبلہ ہے وہ کعبہ ابوطالبؑ کا ہے

اس کو کافر کہنے والے آنہیں سکتے ادھر
کربلا سے خلد تک خطہ ابوطالبؑ کا ہے

روضۂ شہ کے برابر روضۂ غازی نہیں
سرحد اسلام پر پہرا ابوطالبؑ کا ہے

خیمۂ شہ کا طلایا پھر کے کہتا تھا جری
چھو سکے گا کون یہ خیمہ ابوطالبؑ کا ہے

اے مرے اللہ وجہ اللہ میں کس کو کہوں
چہرۂ حیدرؑ ہے یا چہرہ ابوطالبؑ کا ہے

کون گذرے گا ادھر سے اس کے بیٹے کے سوا
کعبے کی دیوار میں رستہ ابوطالبؑ کا ہے

بندگی کی سرحدیں وحدانیت سے مل گئیں
گھر تو ہے اللہ کا بیٹا ابوطالبؑ کا ہے

کیا جدا کر پائے گا کوئی انھیں قرآن سے
باء بسم اللہ میں نقطہ ابوطالبؑ کا ہے

جگمگا اٹھا شب ہجرت کے بستر کا نصیب
چاندی ہے قدرت کی اور سونا ابوطالبؑ کا ہے

کر دیا قربان بیٹوں کو بھتیجوں کے لئے
دل ہے زینب کا مگر جذبہ ابوطالبؑ کا ہے

اے ابو سفیان آکر کربلا میں دیکھ لے
حرملہ تیرا ہے ششماہا ابوطالبؑ کا ہے

نوک نیزہ پر تلاوت کر رہا ہے کس کا سر
لب تو ہیں شبیرؑ کے لہجہ ابوطالبؑ کا ہے

آج تک نسل امیہ سے ہے جاری دیں کی جنگ
آج تک سینہ سپر کنبہ ابوطالبؑ کا ہے

کیا عجب نیرؔ کہے رضوان مجھ سے حشر میں
لے یہ قصر خلد نذرانہ ابوطالبؑ کا ہے

قطعہ

اسیفؔ جائسی

مسرور اس لئے ہیں خواص و عوام آج
پیدا ہوا زمانے میں سب کا امام آج
اک اور آفتابِ امامت ہوا طلوع
دن سے گلے ضرور ملیں صبح و شام آج

قطعہ

شبیبؔ جائسی

سمجھو ذرا کہ محورِ ایمان کون ہے
رب کا فقیر دین کا سلطان کون ہے
اسحٰق نے جلا کے خود اپنی کتاب کو
بتلا دیا محافظِ قرآن کون ہے؟

قصیدہ درمدح
امام حسن عسکری علیہ السلام

علامہ سید کلب احمد ماتیؔ جائسی

دل بشر اگر چہ جی کا مستقل عذاب ہے
وجود کے نظام کا مگر یہ آفتاب ہے

طوافِ شمسِ دل میں ہے تمام کائنات جاں
نظام بھر میں ہر طرف کھچی ہوئی طناب ہے

جو کچھ جہانِ زیست میں ہے دل کے زیر حکم ہے
یہ مملکت پناہ ہے، یہ سلطنت مآب ہے

ہے کون ملکِ جسم میں جو دل کی ہم سری کرے
یہ اپنی خود مثال ہے یہ اپنا خود جواب ہے

تاثرات دل ہی پر ہیں منحصر خوشی و غم
ملول ہو جو دل تو پھر خوشی کا سدّ باب ہے

یہ انبساط کچھ نہیں، یہ انقباض کچھ نہیں
یہ ہیں تغیراتِ دل، یہ دل کا انقلاب ہے

کرشمۂ ادائے دل نتیجۂ رضائے دل
سرور ہے، ملال ہے، سکوں ہے، اضطراب ہے

دوراہے پر ہے آدمی، نعیمِ خلد اک طرف
اور اک طرف بلائے جاں جحیم کا عذاب ہے

دل بشر ہے مقتدر بہ آمریت و شہی
اسی پہ انحصارِ اختیار و اجتناب ہے

مگر ہے عقل رہ نما، بتاتی ہے قدم قدم
یہ راستہ گناہ کا وہ جادۂ ثواب ہے

خطا سے پھر بھی پاک تو نہیں ہے عقل آدمی
ہمیشہ حکمِ عقل کب مفسر صواب ہے

اسی لئے تھے انبیاء، اسی لئے تھے اوصیاء
ہدایت اس کا کام ہے جو عصمت انتساب ہے

اسی لئے تو بوالبشر سے تا بہ ختم مرسلیں
وہ نور اہتدا کا ہے کہ ماند آفتاب ہے

نبیؐ کے بارہ اوصیا بحکمِ محکمِ خدا
ہر اک وصیِ مصطفیٰؐ مثیلِ بوتراب ہے

محمدؐ ان میں سب کے سب بقول سید العرب
کسی کا ذکر بھی ہو اب ثواب ہی ثواب ہے

مگر مرادِ دل یہ ہے کہ آج اس کا وصف ہو
جو شاہ عسکریؑ لقب امامِ شیخ و شباب ہے

یہ مطلع منیر اک امامِ دیں کی شان میں
بساطِ عجزِ مدح کی متاعِ لاجواب ہے

مطلع
حسنؑ کے سلبِ پاک سے عیاں وہ آفتاب ہے
جو حشر تک بفضلِ حق ضیا سے بہرہ یاب ہے

قطعہ
پرندوں کے ہجوم میں ورود ان کا دیکھیے
انھیں نہ کچھ ہراس ہے نہ ذرہ اضطراب ہے

پلنگ و شیر و گرگ سب ہیں جمع گرد شاہ دیں
سر ان کے اور پائے شہ یہ جذب و انجذاب ہے

جو ابر بھی فلک پہ ہے تو بارش ابر سے نہیں　قطعہ　تمام اہل ملک پر مسلط اک عذاب ہے
یہ حال باغداد تھا کہ ایک راہب آگیا　وہ جس کی ظاہری دعا مسبّب سحاب ہے
تزلزلِ عقیدہ میں عوام مبتلا ہوئے　کشادہ بہر مسلمیں مسیحیت کا باب ہے
خلیفہ بھی ہے مضطرب، یہ رنگ عجز ہے کہ اب　درِ امامِ پاک پر سرِ جنوں مآب ہے
یہ شانِ شاہِ دیں نہ تھی کہ دیکھ سکتے گم رہی　یہاں تو کار زندگی ہدایت ثواب ہے
امام اور عوام سب برونِ شہر آگئے　وہ شخص بھی یہیں ہے جو بنائے اضطراب ہے
وہ اس کے ہاتھ، وہ لب ہلے، وہ بادل آگیا　یہ واقعی دعا ہے یا فسونِ مستجاب ہے
کسی نبی کی استخواں ہے انگلیوں کے جوف میں　اور اس سے محض بے خبر ہر ایک شیخ و شاب ہے
ہوا یہ حکم شاہِ دیں کہ لے لو اس کے ہاتھ سے　وہ شئے اثر سے جس کے یہ نمائش سحاب ہے
عمل جو حکم پر کیا تو ابر سب ہَوا ہوا　یہ راہب اب کرے تو کیا عجیب پیچ و تاب ہے
دوگانہ پڑھ کے شاہ نے دعا جو اپنے رب سے کی　گھٹا یہ برسی جھوم کر کہ دشت زیرِ آب ہے
نہ کیوں دعا میں ہو اثر، یہ ہے امامِ بحر و بر　یہ ہے رسولؐ کا پسر، یہ ابن بوتراب ہے
یہ مطلع جدید ہے بہ عرضِ حال و مدعا　ہے عسکریؑ سے التجا، امام سے خطاب ہے
شہ زمن حیات اب مسلسل اضطراب ہے　مطلع　سکوں کی بات اک فقط امید انقلاب ہے
تمھارے نورِ دیدہ کی ضرورت ہے اب دہر میں　تمھیں تو علم ہے شہا کہ سب جہاں خراب ہے
میں عہد ان کا دیکھ لوں یہی ہے آرزوئے دل　عقوبتِ گنہ کا ڈر نہ خوفِ احتساب ہے

فزوں ہے گو شمار سے، گناہِ ماتیؔ حزیں
مگر تمھارے عفو کا، یقین بے حساب ہے

سامان عسکری

تذہیبؔ نگروروی

کب کم ہے ہم غلاموں پہ احسانِ عسکریؑ
آزاد موت سے ہیں غلامانِ عسکریؑ
قرآن ان کے ساتھ ہے یہ اہلبیتؑ ہیں
اللہ کی کتاب ہے سامانِ عسکریؑ

رباعی

حضرت نجمؔ آفندی طاب ثراہ

کس برتے پہ تو حیدری کہلاتا ہے
اپنی ہستی میں کیا خاک جھلک پاتا ہے
تیرا دل بھی نہیں تیرے بس میں
مغرب سے وہ آفتاب پلٹاتا ہے

قصیدہ در مدح

امام حسن عسکری علیہ السلام

لسان الشعراء سید مجاور حسین نقوی تمناؔ جائسی

امام عسکری کی دید کو سارا جہاں ٹھہرا — زمیں پانی پہ ٹھہری اور ہوا پر آسماں ٹھہرا

نگہ ٹھہری تھمیں آنکھیں زیارت کو جگر ٹھہرے — رکی قسمت کی گردش قلب کا دردِ نہاں ٹھہرا

ثوابت بن گئے سیارے گلشن میں ہوا ٹھہری — تھمی جنبش شجر کی شاخ گل پر آشیاں ٹھہرا

رکیں دریا کی لہریں بن گیا آئینہ ہر چشمہ — تھمیں موجیں ہوائے تند کی، آب رواں ٹھہرا

ادب سے نکہتِ غنچہ رہی غنچے میں پوشیدہ — در گلشن تک آکر بوئے گل کا کارواں ٹھہرا

رکی بارش گھٹی سردی زمانہ معتدل آیا — فضا پر چتر بن کر لکۂ ابر رواں ٹھہرا

ہمارے گیارہویں ہادی کا یہ روزِ ولادت ہے — اسی سے شوق نظارہ میں ہر قلب تپاں ٹھہرا

ربیع الآخریں کی آگئی تاریخ لو دسویں — مودب ہو کے دیکھو جو جہاں تھا وہ وہاں ٹھہرا

مسلماں عالم رویا میں نرجس کو کیا جس نے — اسی کے دم سے سچ پوچھو تو ابتک یہ جہاں ٹھہرا

خوشی سے جس نے حضرت کو بٹھایا پشت پر اپنی — کسی راکب سے کب وہ مرکب پیل دماں ٹھہرا

تمناؔ مختصر یہ ہے کہ جو دم بھر نہ تھمتا تھا
خوشی سے آج میرے دل کا وہ دردِ نہاں ٹھہرا

گیارہواں امامؑ ملا

سید رئیس حسین نقوی عاصیؔ جائسی

زمینِ عشق کو پھر آسماں مقام ملا — ہیں شاد اہل ولا گیارہواں امام ملا

امام وقت کی موجودگی سے دنیا کو — نظام صبح ملا اور نظام شام ملا

نقیؑ کی گود میں ہیں عسکریؑ بشانِ امام — مہِ تمام کو یارو! مہِ تمام ملا

خبر زمانے کو دیتے ہیں آج لیل و نہار — سراج صبح ملا اور چراغ شام ملا

علیؑ کے ہاتھ سے پایا حسنؑ زمانے نے — امام وقت کی آغوش سے امام ملا

ثناگر آپ کا اور آپ کے گھرانے کا — نظام زیست میں یہ عاصیؔ غلام ملا